مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ

حیات و خدمات

ڈاکٹر نگار افشاں

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ
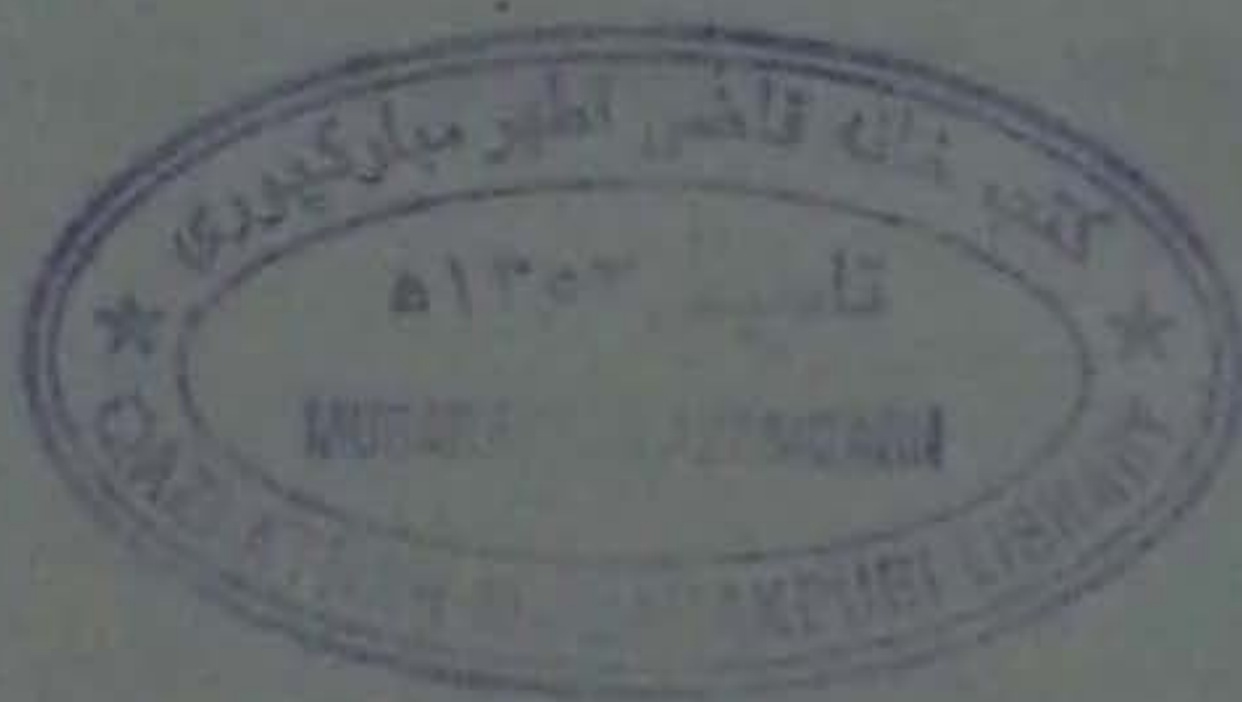
حیات و خدمات

ڈاکٹر نگار افشاں

Maulana Qazi Athar Mubarkpur
Hayat-o-Khidmat

نام کتاب	:	مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ حیات وخدمات
مصنفہ	:	ڈاکٹر نگار افشاں
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۳۰۰ روپے
سن اشاعت	:	۲۰۱۸ء
صفحات	:	۲۳۰
ناشر	:	ایویروز اکاڈمی، علی گڑھ
طباعت	:	ایچ ایس آفسیٹ، دہلی

ISBN : 978-93-84876-96-8

ملنے کے پتے:

☆ بی-۲۸، دلشاد کالونی، نزد عائشہ مسجد، دھرا، علی گڑھ، 8532836792

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

انتساب

عزیز از جان

والدین

اور

دیرینہ رفیق

شمشاد نثار اعظمی

کے نام

جن کی لازوال محبتیں

توجہ اور خلوص میری اس علمی کاوش میں شاملِ حال رہیں۔

فہرست

☆ ائمہ اربعہ
☆ بنات اسلام کی علمی ودینی خدمات
☆ خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات
☆ اسلامی نظام زندگی
☆ افادات حسن بصری
☆ مسلمان
☆ الصالحات
☆ تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں
☆ اسلامی شادی
☆ معارف القرآن
☆ طبقات الحجاج
☆ علی و حسین
☆ حج کے بعد
☆ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک
☆ کاروانِ حیات
☆ مسلمانوں کے ہر طبقہ وہر پیشہ میں علم وعلماء
☆ علماء اسلام کی خونیں داستانیں
☆ آسودگانِ خاک
☆ العقد الثمین (عربی)
☆ جواہر الاصول (عربی)
☆ تاریخ اسماء الثقات
☆ الطبابۃ عند العرب (عربی)
☆ علماء اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں
☆ مراٰۃ العلم (عربی)
☆ مکتوبات امام احمد بن حنبلؒ
☆ چند اہم تصانیف کا تفصیلی جائزہ
☆ عرب وہند عہد رسالت میں
☆ تدوین سیر ومغازی

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین فمن تبعھم باحسان إلیٰ یوم الدین، أما بعد

سرزمینِ ہند میں ابتداء اسلام سے آج تک ہر دور میں ماہرین علوم دینیہ علماء، صوفیاء کرام اور بزرگانِ دین کی بڑی تعداد رہی ہے، حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت سے مسلمان اس سرزمین کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر انفرادی و اجتماعی طور پر ائمہ محدثین اور علماء، صلحاء، فقہاء یہاں تشریف لائے، ان کی آمد کے بعد ہی ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون اور عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت ہوئی اور ملک کے مختلف گوشوں میں ایسے بڑے بڑے نامور اور نابغۂ روزگار علماء، فقہاء، ادباء، شعراء پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک میں بھی اور خصوصاً عرب دنیا میں اپنے تبحر و علمی فضیلت کا سکّہ جمایا اور خراج تحسین حاصل کیا۔

آج دنیا میں مسلمانوں کو جو بھی سرفرازی حاصل ہے وہ بڑی حد تک اسلاف کے عظیم الشان کارناموں اور علمی وقار کی بناء پر ہے، چنانچہ وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ایسی مایہ ناز ہستیاں جو گوشۂ گمنامی میں ہیں، ان پر تحقیق کا کام کر کے ان کی شخصیت کو اجاگر کیا جائے تا کہ ان کے علمی، ادبی سرمائے سے لوگ مستفیض ہو سکیں۔

اگر غور کیا جائے تو علمی دنیا ممتاز شخصیتوں اور وسیع النظر و متبحر عالموں سے کبھی خالی نہیں رہی جو انسانی بلندی کے اعلیٰ معیار پر پورے نہ اترتے ہوں جنھوں نے دنیا میں نفاذِ خیر، عدل، ترویج و اقتدار، آدمیت اور حقوقِ انسانی کی سربلندی و سرفرازی کی خاطر آزمائش کے ہر ہر مرحلہ میں اپنے فریضہ کی ادائیگی میں نمایاں خدمات انجام نہ دی ہوں۔ انھیں عظیم الشان شخصیات میں سے قاضی اطہر مبارک پوری بھی ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی کے قیمتی لمحات بھی انھیں تمام کاموں میں صرف کر دیے۔

میرے لیے یہ امر باعثِ شرف و سعادت ہے کہ شعبۂ سنّی دینیات نے مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ جیسی علمی اور تاریخ ساز شخصیت پر مجھے تحقیقی مقالہ لکھنے کی اہم ذمہ داری سونپی۔ میں نے حتی الامکان اپنی استطاعت کے مطابق مولانا کے عہد اور ماحول، حالاتِ زندگی، تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں، تحقیقات، علمی کاوشیں، شاعری، معاصرین کی نگاہ میں ان کا مقام و مرتبہ وغیرہ پر معلومات جمع کر کے مقالہ کی صورت میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ میں اپنی اس ذمہ داری سے صحیح طور پر سبک دوش ہو سکی ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ اربابِ علم و دانش کریں گے۔

یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے:

بابِ اوّل: عہد اور ماحول

اس عنوان کے تحت قاضی صاحب کا عہد اور اس وقت کی سیاسی، سماجی اور علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کی تحریک، تحریک علی گڑھ، تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ اور تحریک ندوۃ العلماء کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔

باب دوم: حالاتِ زندگی

اس باب میں مولانا کے وطن مالوف اعظم گڑھ کی اہمیت اور اس کے قصبہ مبارک پور کی خصوصیات، اس کے اطراف و جوانب، وہاں کے علماء کرام اور مدارس کا ذکر، مولانا کے تعلیمی مراحل، ان کے اساتذہ و تلامذہ کی تفصیل کے ساتھ ان کے حالات زندگی سے متعلق جو بھی معلومات فراہم ہو سکیں انھیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں مولانا کی علمی لیاقت کی بنا پر ملے ہوئے اعزازات کا بھی ذکر شامل ہے۔

اس باب میں مولانا کے بچپن کے حالات سے لے کر وفات تک کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب سوم: علمی و تصنیفی خدمات

اس عنوان کے تحت مولانا کی علمی و تصنیفی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان کی کتابوں کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کی چند اہم تصانیف کا تفصیلی مطالعہ پیش گیا ہے۔ اس میں مولانا کی تمام تصانیف کا تذکرہ کر کے ان کی علمیت و عبقریت کا اثبات کیا ہے۔ ساتھ ہی

اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جو لوگ قاضی صاحب کی علمی، تصنیفی لیاقت سے نا آشنا ہیں۔ انھیں پوری آشنائی ہو سکے۔ لہٰذا میں نے اس باب میں مولانا کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ، عربی و اردو کی تمام تصانیف کو شامل کیا ہے۔

باب چہارم: صحافت

باب چہارم میں مولانا کی چالیس سالہ صحافتی کاوشوں کو جمع کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے کہ انھوں نے کب اور کیوں اس کام کو اپنایا اور ان تمام اخبار و رسائل کا ذکر اس قدر تفصیل سے کیا ہے تا کہ مولانا کی صحافتی زندگی سے لوگ پوری طرح آشنا ہو سکیں اور اس میں شائع ہونے والی مولانا کی تحریریں بھی پیش کی ہیں جن سے ان کی علمیت کا اظہار ہوتا ہے۔

باب پنجم: شاعری

پانچواں باب مولانا کی شعر و شاعری کے عنوان سے ہے، اس میں ان کے اشعار، نعتیں، نظمیں، غزلیں اور مرثیے وغیرہ شامل ہیں۔ ابتدا میں قاضی صاحب نے شاعری کے ذریعے اپنی پہچان بنائی تھی اور شعر و شاعری ہی انھیں آگے بڑھانے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ لیکن بعد میں جب مولانا نے تصنیفی و تالیفی کام کی ابتداء کی تو اسے ترک کر دیا۔

باب ششم: معاصر اہل علم کی نظر میں

اس باب میں مولانا کے معاصر علماء و رفقاء سے روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا کا مقام و مرتبہ اور ان کا احترام ان کے معاصرین کی نگاہ میں کیا تھا۔

یہ چھ ابواب ہیں جن پر میں نے حسب استطاعت لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بہت سی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ کوئی بھی تحریر حرفِ آخر نہیں ہوتی اور جب بھی کوئی طالب علم ریسرچ کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اسے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کا مجھے بھی تجربہ ہوا۔ اور اس راہ میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں جن کا میں نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور ہر طرح کی کوششیں جاری رکھیں۔

اس سلسلے میں میں نے قاضی صاحب کے افراد خانہ سے براہِ راست ملاقات کی اور ان کے دوست و احباب سے بھی ربط و ضبط رکھا جن سے کافی معلومات فراہم ہوئیں۔ سب سے زیادہ معلومات مولانا کے فرزند سلمان مبشر صاحب نے بہم پہنچائیں، میں ان کی بہت ممنون و مشکور ہوں۔ اس کے علاوہ اس کام کی تکمیل کے لیے میں نے مولانا آزاد لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، رضا لائبریری رام پور سے بھی استفادہ کیا۔ ساتھ ہی مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی لائبریریوں سے بھی میں نے بہت سا مواد اکٹھا کیا، جس میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، شعبۂ عربی، شعبہ اردو، شعبۂ دینیات شامل ہیں۔ جو کتابیں یہاں نہیں مل سکیں انھیں میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے کتب خانوں سے حاصل کیا۔ وہیں سے مجھے ماہ نامہ البلاغ کی فائلیں بھی حاصل ہوئیں جن میں مولانا کے بہت سے مضامین شائع ہوئے تھے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا تھا، اس لیے مواد کا ملنا خاصا دشوار کام تھا۔ اس کی تکمیل میں زیادہ تر میں نے قاضی اطہر صاحب کی خودنوشت سوانح ''کاروانِ حیات'' سے ہی مواد اکٹھا کیا ہے اور اردو مجلّہ ''ترجمان الاسلام بنارس''، ضیاء الاسلام''، شیخو پور اعظم گڑھ، جن سے مجھے بھرپور مدد ملی۔ یہ دونوں مجلّے ''قاضی اطہر نمبر'' کے نام سے نکلے اور ان میں شائع شدہ مضامین سے مجھے خاصی معلومات حاصل ہوئیں اور اس کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد میں بھی چند ایک مضامین تھے جن سے میں نے مدد لی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے مجھے اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے کی توفیق بخشی۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کے شکر و احسان کے بعد میں اپنی نگراں ڈاکٹر قیصر حبیب صاحبہ کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے مجھے ریسرچ کے اصولوں سے واقف کرایا اور وقتاً فوقتاً مجھے اپنے زرّیں مشوروں سے نوازا، اس طرح صحیح معنوں میں انھوں نے میری رہنمائی کی۔ ان کے بارے میں میں یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ وہ صرف میری نگراں ہی نہیں بلکہ میری مشفق ماں کی طرح تھیں، لہٰذا ان کا احترام و اکرام میں اپنا فریضہ سمجھتی ہوں اور دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین)

معاونین کا شکریہ ادا کرنا فعل مستحسن ہے، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں صمیم قلب سے ان تمام حضرات کی شکر گذار ہوں جنھوں نے ضرورت پڑنے پر مجھے اپنے زرّیں مشوروں سے نوازا اور میری معاونت کی۔ اس لیے ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ'' کے زرّیں اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں شعبۂ دینیات کے سابق ڈین پروفیسر سعود عالم قاسمی اور چیرمین ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی حوصلہ افزائی

نے مجھے اس مقام تک پہنچایا اور ساتھ ہی میں نے اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ ڈاکٹر محمد سلیم، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں، ڈاکٹر محمد حبیب اللہ، ڈاکٹر احسان اللہ فہد، ڈاکٹر محبوب الرحمٰن، ڈاکٹر عبدالاحد اور ڈاکٹر محمد راشد اصلاحی کی بہت ممنون و مشکور ہوں۔ ڈاکٹر توقیر عالم صاحب اور ڈاکٹر محمد سلیم صاحب نے اس مقالے کی تکمیل میں میری معاونت کی ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ انھیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

ان کے علاوہ میں تہہ دل سے ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحب کی شکر گذار ہوں جنھوں نے میرے ہر طرح کے استفسار پر مدد کی اور جو ایک دینی بھائی کا فریضہ ہوتا ہے اسے پورا کر دکھایا۔ انھوں نے ہر ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور میرے مقالے کا بغور جائزہ لے کر اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور میری غلطیوں کی نشان دہی کی۔ انھیں کی مدد سے میں نے اپنے مقالے کو اختتام تک پہنچایا۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں شعبۂ عربی کے استاذ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کا شکریہ نہ ادا کروں، میں ان کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے مقالے پر نظر ثانی کی اور بہت سی اصلاح و ترمیم بھی کی اور اپنی بہترین ہدایات دے کر تصحیح کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی ہوں، انھوں نے میرے مقالے کے ابواب قائم کرنے میں میری رہنمائی کی۔

ان تمام حضرات کے بعد میں اپنے اعزہ و اقارب کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں، سب سے پہلے میں اپنے زوج محترم شمشاد نثار صاحب کی مشکور ہوں جنھوں نے نہ صرف مجھے ریسرچ کرنے کی اجازت دی بلکہ دامے، درمے، قدمے، سخنے میری مدد کی۔ میں مقالے کی تکمیل میں بہت مصروف رہی اکثر گھر پر بھی دیر سے آنا ہوتا مگر کبھی میں نے ان کی پیشانی پر ناگواری کے آثار نہیں دیکھے۔ ان کی یہی خوبی میرے لیے اطمینان کا باعث بنی جس نے میری ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کی اور میری کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

اگر میں اپنے بچوں کا ذکر نہ کروں تو یہ بھی بڑی ناسپاسی ہوگی، کیونکہ میرے بچوں نے میرا بھرپور تعاون کیا ہے۔ کبھی مجھے پڑھائی کے دوران پریشان نہیں کیا، اس لیے میں

اپنے چاروں بچوں-محمد ارسلان، سندس ارم، سدرہ ارم اور یسرا ارم کو اس بات کا حق دار سمجھتی ہوں کہ انھوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ میں اپنی والدہ محترمہ، ماموں اور بھائیوں کی بھی مشکور ہوں، انھوں نے میری ہمیشہ عزت افزائی کی اور میرے حوصلے کو جلا بخشی۔ میرے ماموں رضی الدین صاحب نے ہی بچپن سے مجھے اس لائق بنایا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں۔ اور اس اہم کام میں میری ساس قدسیہ بیگم صاحبہ نے میری بہت حوصلہ افزائی کی ان کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں تادیر ان کا سایہ میرے سر پر قائم رہے۔

آخر میں میں ان تمام احباب کی شکر گذار ہوں جنھوں نے میرے اس علمی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام معاونین و مخلصین کو اجر عظیم سے نوازے۔

آمین

نگار افشاں

تاریخ : اکتوبر ۲۰۱۸ء

شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان

مبارک پور، اعظم گڑھ، اتر پردیش، الہند
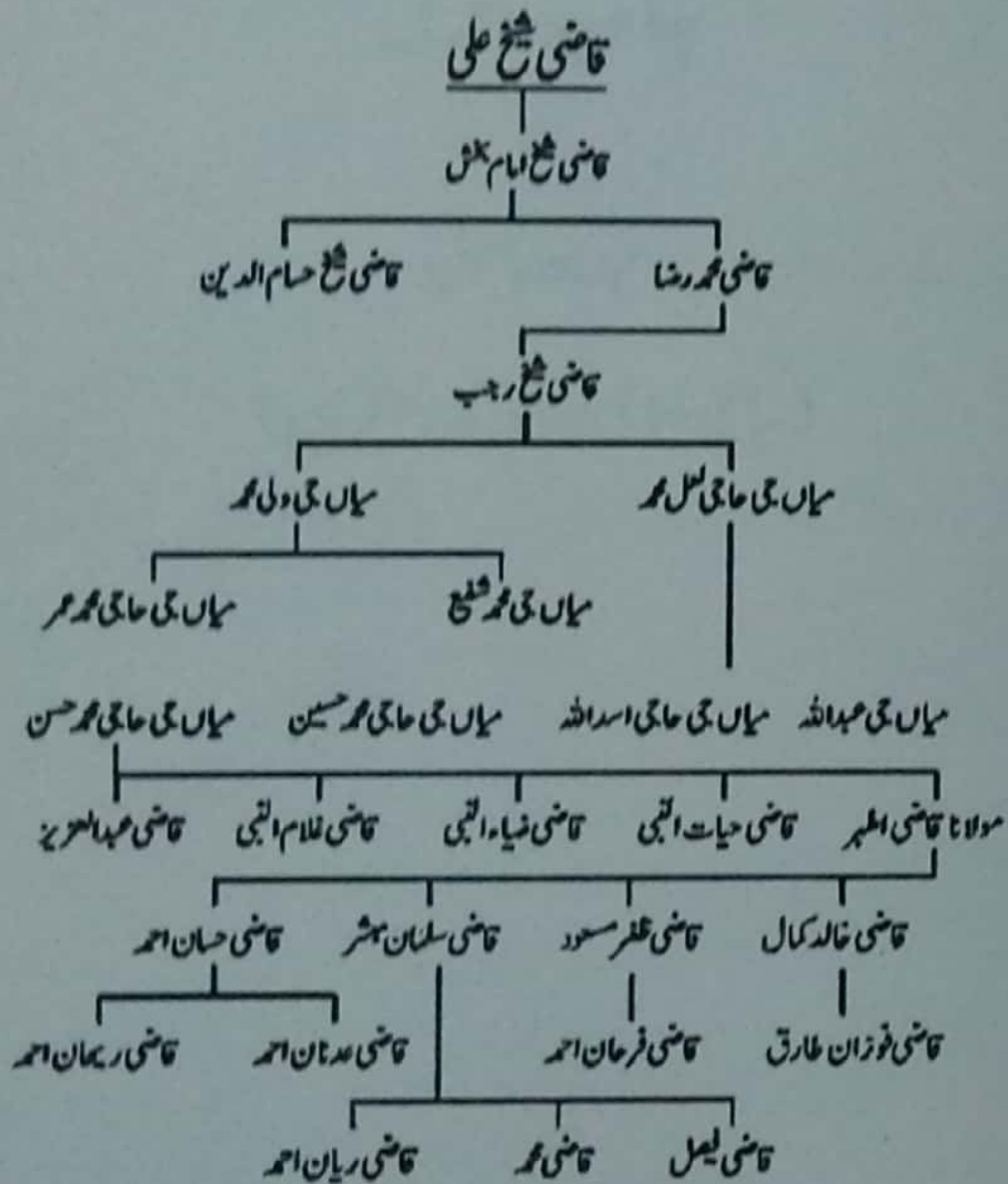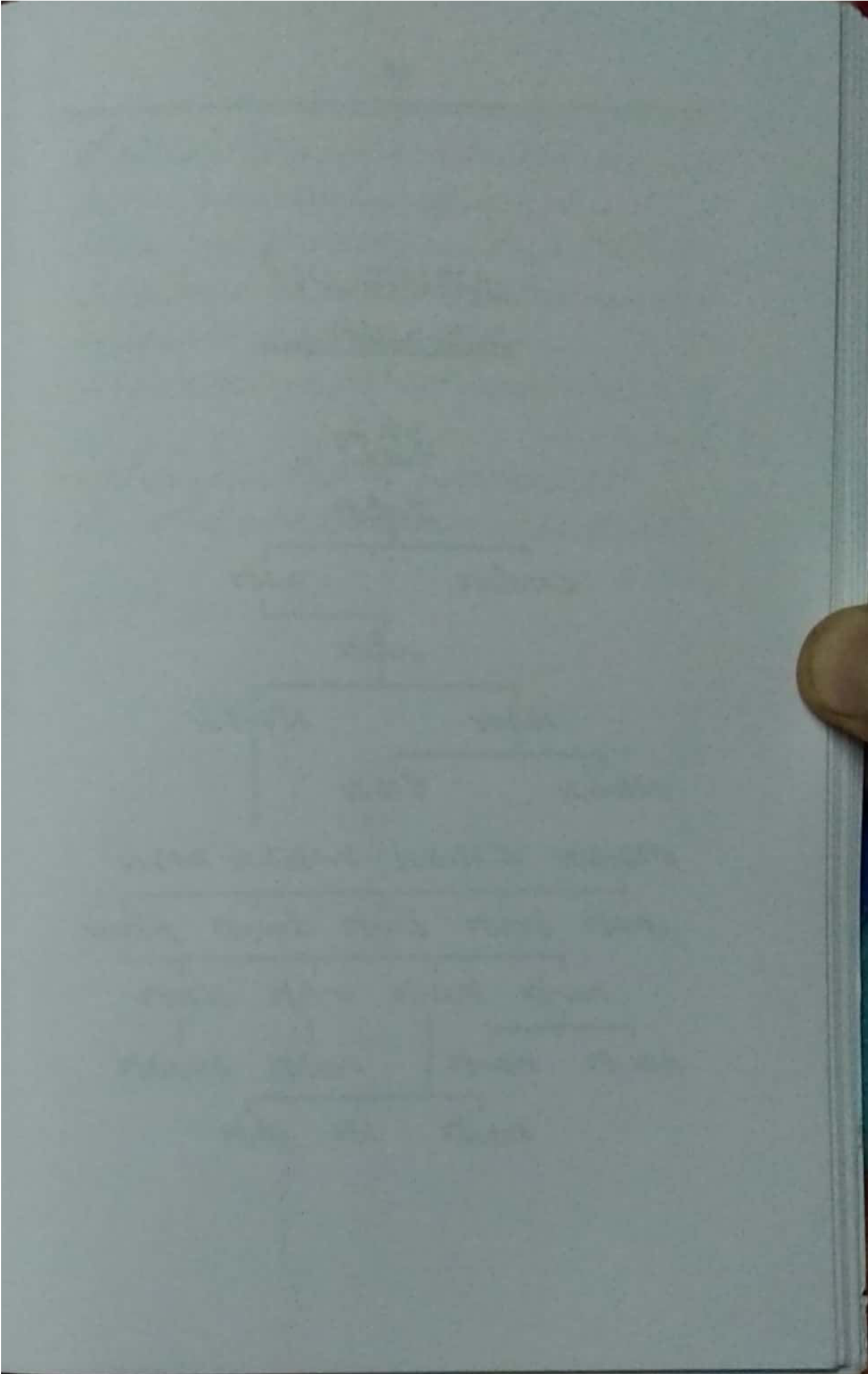
باب اول

عہد اور ماحول

(سیاسی، سماجی اور علمی پس منظر میں)

ہر انسان کی شخصیت پر مختلف عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ خواہ وہ عوامل خارجی ہوں یا داخلی کسی نہ کسی پہلو سے ضرور اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور ہر شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اسی لیے کسی بھی اعلیٰ فن کار کے عناصر ترکیبی کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد اور ماحول کا پس منظر جاننا بھی نہایت ضروری ہے، جس کے اثرات کے نقوش کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر نظر آتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہر فن کار خواہ وہ شاعر ہو یا ادیب، محقق ہو یا مصنفؔ ضرور اپنے دور کے اثرات قبول کرتے ہیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، تہذیبی ہوں یا تمدنی، علمی ہوں یا غیر علمی وغیرہ۔

لہٰذا ہر شخص اپنے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور بہت کچھ سکھاتا بھی ہے اور جس میں یہ جذبہ نہیں ہے تو اس کی شخصیت ادھوری ہے، جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تحریر سے واضح ہے:

> ''انسان کی ذہنی اور فکری نشو ونما میں ماحول کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے، وہ اپنی ہمت اور توفیق الٰہی کے مطابق بہت کچھ ماحول سے لیتا بھی ہے اور بہت کچھ اس کو دیتا بھی ہے۔ اس طرح ردّ وقبول، جذب و انجذاب، تقلید واجتہاد کی خاموش لیکن طویل کش مکش کے بعد اس کی شخصیت کا مرکز متعین ہوتا ہے، اسی بناء پر کسی انسان کو اس کے ماحول سے ہٹا کر سمجھنے کی کوشش کبھی بارآور نہیں ہوسکتی'' ۔[۱]

اس لیے اس باب میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کی حیات کے مختلف گوشوں وعلمی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے قبل اس وقت کی سیاسی، سماجی اور علمی سرگرمیوں کا جائزہ لینا ضروری ہے جن سے مولانا متاثر ہوئے۔

سیاسی حالات

قاضی اطہر مبارک پوری کا عہد (۱۹۱۶-۱۹۹۶ء) ہے۔ یہ دور بڑا پر آشوب اور ہنگامہ خیز تھا۔ اس باب میں ان کے عہد کے ماقبل اور مابعد کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ وہ دور تھا کہ جسے مختلف حیثیتوں سے اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت سیاست کا بول بالا تھا، جس کی وجہ سے کئی تنظیموں کا قیام ہوا، جن میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، مجلس خلافت، تحریک ترکِ موالات اور جمعیۃ العلماء وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کا دور نہایت افراتفری کا دور تھا، جو مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا، کیونکہ اسی دور میں ہندوستانی مسلمانوں کا زوال شروع ہوگیا تھا، جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی سیاست کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ایک طرف ان کے اندر جماعتی بدنظمی اور دینی انحراف پھیل رہا تھا تو دوسری طرف آریوں اور عیسائیوں نے اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کردیے۔ غرضیکہ ۱۸۵۷ء کے حوادث و واقعات نے ہندوستان کی سیاسی جہتوں کو بدل کررکھ دیا اور ہنگامہ خیز صورت پیدا کردی۔

چنانچہ (۱۸۵۸-۱۹۰۰ء) یعنی بیالیس سال تک کا زمانہ ہندوستان کی غلامی کا بدترین دور تھا۔ انگریزوں کی وحشت و بربریت پورے شباب پر تھی، وہ اپنے استحکام حکومت کے لیے نئی نئی تدبیریں سوچتے تھے کہ کس طرح ملک میں خوف و ہراس کی فضا قائم کریں۔ انھوں نے ایک نیا پروپیگنڈا تیار کیا کہ جس نے آزادی مانگی اسے طوق وسلاسل عطا کیے اور اس پر جھوٹے الزامات لگا کر مفلوج بنادیا، پھر جب مسلمان سیاسی، سماجی اور علمی اعتبار سے کمزور ہوگئے تو ان میں عیسائیت کو فروغ دیا جانے لگا اور باضابطہ اس کی تربیت گاہ قائم کی گئی اور سیاست کی آڑ میں ہندوستانیوں کے مذہب پر بھی حملہ ہونے لگا۔[۲]

۱۹۰۰ء میں سیاست کا غلبہ اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ جامع مسجد دہلی کو گرجا گھر بنانے کی سازش رچی، تاکہ اس کے ذریعے ہندوستان میں پادری فنڈ کی آمد ہو۔ حد تو یہ تھی کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو چیلنج کرتے اور مناظرے کی دعوت دیتے۔ عیسائیوں کی سب سے رذیل سازش یہ تھی کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب ''میزان الحق'' کو

الہامی کتاب بتا کر لوگوں کو گمراہ کیا اور اسکولوں میں بھی عیسائیت کی تبلیغ کرنے لگے، اس لیے بہت سے مسلمانوں اور ہندوؤں نے ان کے جھانسے میں آ کر عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ یہ ان کی مجبوری تھی یا ڈر اور خوف کیونکہ پادریوں کے سفارش کے بغیر ملازمت کا ملنا بھی دشوار تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی نے اس وقت کی نزاکت یوں بیان کی ہے:

''ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف شکاری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھرنے کو مل جاتا تھا۔ مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ زوران مسلمانوں پر تھا۔ اس لیے ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہی ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے، حتی کہ بانی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع واقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور کم علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔''[۳]

یہ ساری تگ و دو صرف مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لیے تھی تاکہ مسلمان جب ہر لحاظ سے کمزور ہو جائیں گے تو ان پر غلبہ پانا آسان ہو جائے گا اور حکومت مستحکم ہو جائے گی۔ ایسے حالات میں علماء کرام نے اپنے جوش ایمانی کا ثبوت دیا، جب کہ ننگی تلواریں ان کے سروں پر لٹک رہی تھیں اور یہ لوگ آگ اگلتی ہوئی رائفلوں کی زد میں تھے۔ ان علماء نے عیسائی پادریوں کو ذلت آمیز شکستیں دیں اور برطانوی حکومت کے استقلال اور ان کے ناپاک ارادوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ڈاکٹر وزیر خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[۴]

اس بحرانی دور میں ایسے حالات بھی پیش آئے کہ علماء کرام اور مشائخ عظام کی پگڑیاں تار تار کر دی گئیں۔ نیشنلسٹ رہنماؤں کے گلے میں جوتوں کے ہار پہنائے گئے، انھیں گالیوں سے نوازا گیا، ان کی داڑھیوں میں شراب کی بوتلیں انڈیلی گئیں، ان کی عبائیں نوچ نوچ کر روندی گئیں، جن ہاتھوں نے اس کے خلاف کچھ لکھنے کی جسارت کی

ان کی انگلیاں تراش دی گئیں۔ اس دور میں مسلمان ایسے نامساعد حالات سے دوچار ہورہے تھے۔

آخر کار بیسویں صدی کی ابتداء میں سیاسی بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی، برطانوی حکومت نے جب ہندوستانیوں کے احتجاج کی کوئی پروانہیں کی تو علی برادران (محمد علی، شوکت علی) نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کا دورہ کر کے پورے ملک کو ترک موالات کے غلغلہ سے بھر دیا۔۵

حالات یہ ہوئے کہ سرکاری ملازمین نے اپنی ملازمتیں ترک کر دیں، طلباء نے سرکاری اسکول چھوڑ دیا اور کونسل کے ممبروں نے اپنی ممبری لوٹا دی، حتی کہ سرکاری خطاب یافتوں نے اپنے دیے گئے خطابات واپس کر دیے اور پورے ملک میں انگریزی کپڑوں کے بائیکاٹ کا سلسلہ جاری ہوا، دیسی کپڑے پہنے جانے لگے۔۶

تحریک ترک موالات میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی قدم بہ قدم تھے۔ ان میں گوکرن پرشاد اور برج بہاری لال وکیل پیش پیش تھے۔۷ ''ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کا روح پرور اور زبردست نظارہ پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا''۔۸

۱۹۰۸ء میں انقلاب پسندوں پر بنارس سازش کیس چلایا گیا۔ اخبارات پر پابندی عائد کی گئی اور ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ برطانوی حکومت نے اپنی سیاست کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو بھی ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ چنانچہ پورے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کے لیے کئی شوشے قائم کیے گئے۔ آخر کار یہ طوفانی بلا ۱۹۱۶ء کو اپنے شباب پر پہنچ گئی۔

۱۹۱۲ء کا زمانہ مسلمانان ہند کی سیاست کے لیے بالکل منفرد ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان پولیٹکل جدّ وجہد سے الگ رہنے کو اپنی قومی پالیسی سمجھتے تھے۔ اس لیے ملک کی پوری سیاسی زندگی کا میدان غیر مسلموں کے لیے خالی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی جس کا مقصد ملک کی عام ترقی کو روک دینا تھا، چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کا پولیٹکل کام یہ نہیں ہے کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہندوؤں کی پولیٹکل جدّ وجہد کی مخالفت کرے۔۹

مگر ۱۹۱۳ء کے اجلاس سے مسلم لیگ نے اپنا نصب العین ''برادر وطن سے اتحاد

اور ہندوستان کے لیے حکومتِ خوداختیاری حاصل کرنا قرار دیا‘‘۔۱۰

بہر حال! اس زمانے میں محمد علی جناح کانگریس کے سرگرم لیڈر تھے، مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بہت جلد اس تحریک کے کامیاب لیڈر بن گئے۔ ۱۹۲۰ء تک انھوں نے کانگریس اور لیگ کے تعلقات کو بحال رکھا، مگر کانگریس سے الگ ہوتے ہی دونوں تنظیمیں دور ہو گئیں۔۱۱

اگست ۱۹۱۳ء میں طرابلس و بلقان کی جنگ جاری تھی اور حکومت برطانیہ کی پالیسی سے مسلمانوں کے دل غم وغصّہ سے لبریز تھے، کہ اسی اثناء میں مسجد کان پور کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ میونسپل حکّام نے ایک نوتعمیر سڑک سیدھی کرنے کے لیے مچھلی بازار کان پور کی مسجد کا دالان اور وضوخانہ منہدم کر دیا۔ جب غیرت مند مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور گری ہوئی اینٹیں شکستہ دیوار پر رکھ کر درست کرنے لگے تو پولیس نے آ کر پوری مسجد ہی گرادی، جس سے مسلمان مشتعل ہو گئے، انھوں نے اس معاملے میں بہت احتجاج کیا، رسائل و جرائد میں مضامین کے ذریعے اس امر کی مذمت کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ اور مولانا ظفر علی خاں نے ’’زمیندار‘‘ میں احتجاجی مضامین لکھے۱۲، مگر حکومت پر ان تمام باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ آخر کار مسلمانوں نے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کی ٹھان لی۔ ابھی مسلمان اینٹیں ہی درست کر رہے تھے کہ انگریزی ڈپٹی کمشنر نے فوج سے گولی چلوادی، اندھادھند گولیاں چلتی رہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے شہیدوں کے انبار لگ گئے۔ اس اندوہ ناک واقعہ سے سبھی لوگ مشتعل ہو گئے۔

آخر کار چند ہمدردانِ قوم نے ایک وفد انگلستان بھیجا، چنانچہ وہاں سے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو ہدایت ملی کہ مسلمانوں کا احتجاج جائز ہے اور پھر مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی۔۱۳

۱۹۱۶ء میں بال گنگادھر تلک نے ’’ہوم رول‘‘ کی تحریک شروع کی جس میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے مل کر ہندوستان کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۹ء تک کا دور ہوم رول کی تحریک کا عہد شباب تھا، اس وقت ہندو اور مسلمان ایڑی چوٹی کا زور لگا کر خوداختیاری حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی تمام کوششیں اور جدّ وجہد ناکام ہو گئیں اور خوداختیاری کا خواب بے تعبیر ثابت ہوا۔۱۴

۱۹۱۸ء میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو جیمسفورڈ کی کوشش سے ہندوستانیوں کو نظامِ حکومت میں کافی حقوق دیے گئے۔ ۱۵؎

۱۹۱۹ء کو مہاتما گاندھی نے انگریزوں کے خلاف ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا، جس کی وجہ سے ملک گیر پیمانے پر اس تحریک کا آغاز ہوا۔ پورے ہندوستان میں ہڑتال شروع ہوگئی۔ مختلف جگہوں پر احتجاجی جلسے ہوئے اور اسی دوران جلیاں والا باغ میں بھی احتجاجی جلسہ ہوا جس میں جنرل ڈائر نے وہاں پہنچ کر گولیاں چلوادیں اور جلیاں والا باغ آن کی آن میں شہیدانِ وطن کے خوں سے لالہ زار ہوگیا۔ اس حادثہ میں تقریباً پندرہ سو انسان زخمی ہوئے، بے شمار مارے گئے اور گرفتار ہوئے۔ ۱۶؎

پہلی جنگ عظیم اور ترکوں کی شکست کے بعد مسلمانوں نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر خلافت کی تحریک شروع کی، تاکہ سلطنت کی سالمیت اور خلافت کے وقار کو قائم رکھا جائے اور حکومت برطانیہ پر زور ڈالا جائے اور خلافت کے ادارے کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ ان نئے حالات میں قدرتی طور پر خلافت کانفرنس (جس کا رخ باہر کے مسلمان ملکوں کی طرف پھر گیا تھا) اپنے ملک کی قومی تحریک سے دور رہنے لگی، مگر اس کے بعض ممتاز رہنما جن میں مولانا محمد علی بھی شامل تھے، برابر کانگریس کے ساتھ رہے اور ان حضرات نے مسلم لیگ کے اندر بھی ایک مضبوط گروپ بنالیا اور جمعیۃ العلماء بھی بعض معاملات میں مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کا ساتھ دیتی رہی۔ ۱۷؎

۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کا امرتسر میں اجلاس منعقد ہوا، جس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا، مگر اس تحریک کے لوگوں نے اس غرض سے قائم رکھا کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو، لیکن مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنے اعلان کے ذریعے خلافت کا خاتمہ کر دیا، جس سے محمد علی اور ان کے ہم خیالوں کو دلی رنج ہوا، چنانچہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کی موت و زیست کا مسئلہ بن گیا، اس لیے انھوں نے جس کو اپنا مخالف سمجھا اس کا سیاسی وجود ہی ختم کر دیا۔ ۱۸؎

۱۹۱۹ء میں ہی مجلسِ خلافت اور مسلمانوں میں قومی جدّ و جہد کو فروغ دینے کے لیے جمعیۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹؎

خلافت کے بانیوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا کفایت اللہ، علی برادران، حکیم اجمل اور بہت سے علماء و سیاسی لیڈران شامل تھے اور جمعیۃ علماءِ ہند کے

بانیوں میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری، مولانا عبدالماجد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور دیگر علماء کرام شریک تھے۔[۲۰]

پھر ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اور ترکِ موالات کا اصول منظور کیا گیا، لیکن ابھی تک ترکوں کی شکایتیں رفع نہیں ہوئی تھیں، اس لیے مسلمانوں نے وائے سرائے کو بھیجا کہ تحریک عدم تعاون شروع کی جائے، لہٰذا دوسرا اجلاس بھی الہ آباد میں ہوا اور ۱۹۲۰ء کو ہی تحریک عدم تعاون شروع کردی گئی۔ مسلمان بڑے جذبے کے ساتھ میدان جہاد میں اترے، کانگریس نے خلافت کمیٹی کا جرأت مندانہ اقدام دیکھ کر کلکتہ کے اجلاس میں نان کوآپریشن کی تجویز منظور کرلی۔[۲۱]

اسی سال تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے ترک موالات کا فتویٰ شائع ہوا جس میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ موالات ونصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنا حرام ہے۔ اسی تجویز کی بناء پر شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی پر مقدمہ چلایا گیا جو "کراچی کیس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو، شوکت علی، پیر غلام مجدد، مفتی نثار احمد کانپوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے۔[۲۲]

۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں عروج پر تھیں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد تھا، اس لیے سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے رہنما علی برادران تحریک خلافت کے روح رواں تھے، تو گاندھی جی تحریک سول نافرمانی کی قیادت کررہے تھے، دونوں تحریکیں شانہ بشانہ تھیں اور دونوں کا نشانہ برطانوی سامراج تھا۔

حالات یہ ہوئے کہ تحریک خلافت سے سیاسی بیداری عام ہوتی جارہی تھی اور عوام بھی اپنی طاقت پہچاننے لگے تھے، جس کی وجہ سے انھوں نے سول نافرمانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، انھیں انگریزوں سے اتنی شدید نفرت ہوگئی کہ ان سے اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھنے لگے۔

۱۹۲۲ء میں ضلع گورکھ پور میں زبردست ہنگامہ ہوا جو اسی غصہ اور نفرت کا نتیجہ تھا، جس میں عوام اور پولیس دونوں شریک تھے۔ وہاں کے لوگوں نے کافی لوٹ کھسوٹ کی اور

تھانہ پر آگ زنی کر کے لاتعداد سپاہیوں کو زندہ جلادیا، اس ہنگامے کو دیکھ کر گاندھی جی نے اس تحریک کو بند کرنے کا اعلان کر دیا۔

۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں سوامی شردھانند نے شدھی سنگھٹن تحریک کا آغاز کیا، یہ تحریک ملکانوں کے علاقے سے شروع کی گئی اور ہزاروں ملکان مرتد ہو گئے، تو جمعیۃ علماء ہند نے اپنی پوری طاقت کا زور لگا کر اس فتنے کو دفن کر دیا اور تمام مرتدین کو از سر نو اسلام پر قائم رکھا، اس کار خیر میں مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا وحید حسن ٹونکی اور مولانا محمد عرفان صاحب کا نام سرفہرست ہے۔

۱۹۲۷ء میں آئینی اصلاحات کی سفارش پیش کرنے کے لیے سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا۔ اس کمیشن کے ارکان انگریز تھے، جس سے عوام کو سخت اذیت ہوئی اور علی الاعلان ہندو مسلم دونوں کے دستخط سے کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا گیا۔

دستخط کرنے والوں میں سر علی امام، سیتلو داس، تیج بہادر سپرو، پرشوتم داس ٹھاکر، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، نواب اسماعیل خاں شامل تھے۔

۱۹۲۸ء کو ممبئی کی آل پارٹیز کانفرنس قائم ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں لندن کی گول میز کانفرنس، ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ''، ۱۹۳۷ء میں کانگریس کو آٹھ ریاستوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور انتخابات سے قبل کانگریس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کر لی۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا، جس میں ہندو مسلم کو دو الگ الگ قومیں قرار دے کر ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی قرارداد منظور کی گئی۔ [۲۳]

اس طرح کی بہت سی سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں جس سے ہندوستان کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔

سماجی حالات

ہندوستان ہمیشہ مختلف مذاہب وادیان کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں ہر شہر میں دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ آ کر آباد ہوئے، ان کا اختلاف صرف رنگ و نسل تک ہی محدود نہ تھا بلکہ یہ لوگ معاش و معیشت، زبان وعقائد، نظریات وافکار اور تہذیب وتمدن میں بھی مختلف تھے، اسی وجہ سے ہندوستان میں ایک سماجی تہذیب کا ارتقاء ہوا۔

جب انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی زینہ سے ہندوستان میں قدم رکھا تو اپنے مذہب اور تعلیم وتہذیب کے فروغ کی کوششیں کیں جس سے ہندوستان میں مغربی تہذیب اور عیسائیت کی نشو ونما ہوئی اور اس سے خاص طور سے نوجوان نسلیں متأثر ہونے لگیں، اسی وجہ سے سماجی اصلاح کی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

یوں تو ہندوؤں میں سماجی اصلاح کی تحریک ۱۸۵۷ء سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی، جن میں سب سے قابل ذکر برہموسماج ہے، جسے راجہ رام موہن رائے نے ۱۹۲۸ء میں قائم کیا تھا۔ اس تحریک کی دو قسمیں تھیں ایک مذہبی دوسری سماجی۔

مذہبی اعتبار سے اس تحریک کا مقصد ہندومت میں پائی جانے والی اور ہندوؤں کی مقدّس ومحترم کتابوں سے ثابت شدہ وحدانیت ہے۔ اس تحریک کے بانی راجہ رام موہن رائے بھی وحدتِ خدا کے قائل تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ مورتی پوجا کو ناپسند کیا، بلکہ وہ اسے ہندو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے، ان کی کوششوں کے نتیجے میں ہندوعورتوں کو بہت سے حقوق ملے، کیونکہ اس سے قبل ہندوعورتوں کی حالت بہت پست تھی ان میں بہت سی قبیح رسمیں رائج تھیں۔ مثلاً ستی کی رسم، کم عمری کی شادی اور بیوہ کو نکاح ثانی کی عدم اجازت وغیرہ، یہ ایسی رسمیں تھیں جو کسی بھی لحاظ سے قابل قبول نہ تھیں۔ راجہ رام موہن رائے نے ان تمام رسموں کا خاتمہ کیا اور لڑکیوں کی تعلیم عام کی۔[۲۴]

برہموسماج کی تحریک کا اثر زیادہ تر بنگال تک محدود تھا اور اسی کی ایک شاخ "پرارتھنا" سماج بھی تھی، جو ممبئی میں پروان چڑھی، اس کا مقصد بھی تقریباً وہی تھا جو راجہ رام موہن رائے کی تحریک کا تھا۔ یعنی بیواؤں کا نکاح ثانی، پس ماندہ قوم میں بیداری اور عورتوں کی فلاح و بہبود۔

پرارتھنا سماج کے روح رواں مہادیو گووند رانا ڈے تھے، جن کی کوششوں سے مغربی ہندوستان میں دکن تعلیم سوسائٹی انڈین سوشل کانفرنس اور تنظیم بیاہ بیوگان وغیرہ متعدد تنظیمیں قائم ہوئی۔ رانا ڈے کے علاوہ پرارتھنا سماج کے ایک رہنما رام کرشن بھنڈار بھی تھے۔ ۲۵

یہ دونوں تحریکیں مغربی تہذیب وتمدن کی پیداوار تھیں، ان کے برعکس آریہ سماجی تحریک ہندوستان کے ماضی سے فیضان حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی تھے، ان کی تحریک کا مقصد بھی سماجی اصلاح تھا، جس میں بچپن کی شادی سے لے کر ذات پات کی بندشیں، تعلیم نسواں اور بیواؤں کی دوبارہ شادی وغیرہ شامل تھی۔

اسی طرح آریہ سماجی تحریک بھی قائم ہوئی جس نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو آزاد انسانوں کی حیثیت سے اپنے سماج میں شامل کرلیا، مگر انھیں سماجی درجہ بندی میں سب سے نیچا درجہ دیا جو بعض لحاظ سے غلاموں سے بھی بدتر تھا۔ ۲۶

آریہ سماجی تحریک کو سوامی دیانند کے بعد لالہ ہنس راج، لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند نے آگے بڑھایا۔ شدھی تحریک اس سے بہت متاثر ہوئی۔

انیسویں صدی کی چوتھی اہم سماجی تحریک رام کرشن مشن کے نام سے مشہور ہوئی، یہ واضح رہے کہ (برہموسماج اور پرارتھنا سماج مغربیت کی طرف مائل تھی) آریہ سماج پر قدیم ہندومت غالب تھا۔

انھیں تمام تحریکات میں مسز اینی بیسنٹ کی تحریک بھی قابل تعریف ہے۔ انھیں کی سعی وجہد سے بنارس میں مرکزی ہندوانی مدرسہ قائم کیا گیا جو کچھ دنوں کے بعد کالج بنا اور پھر ۱۹۱۵ء میں ہندو یونیورسٹی کی شکل اختیار کرگیا۔

مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوؤں کی جو تحریکیں سرگرم ہوئیں ان میں گوکھلے کی بھارت سیوک سماج ۱۹۰۵ء میں، نرائن لمبار جوشی کی سوشل سروس لیگ ۱۹۱۱ء میں، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس ۱۹۲۰ء میں، مہاتما گاندھی کی ہریجن سیوک سماج ۱۹۳۳ء میں قائم ہوئیں۔ ۲۷

ان تمام تحریکات نے ہندوستانی سماج کی خدمات میں اہم رول ادا کیا۔

ہندوؤں کے سماج سدھار اور مذہب کے تحفظ واصلاح کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی

اس تگ و دو میں برابر سرگرم عمل رہے، جب ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ زوال پزیر ہوئی تو مسلمان بے شمار مصائب و مشکلات میں گھر گئے، ان کا سیاسی، معاشی اور اقتصادی وقار ملیامیٹ ہوگیا، حتی کہ عقائد و نظریات بھی متاثر ہونے لگے اور قومی وجود بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ ۲۸

اس وقت مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اپنے دین و عقیدہ کی حفاظت کی جائے، چنانچہ اسی احساس و افکار کے نتیجے میں کئی تحریکیں وجود میں آئیں جس کے ذریعے ہندوستانی سماج کے ہر طبقہ کی روایات، رسم و رواج، خیالات، عادات و اطوار، طرز معاشرت و معیشت میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ان تحریکوں میں تحریک شاہ ولی اللہ، تحریک مجاہدین، تحریک خلافت، تحریک ریشمی رومال، تحریک احرار، تحریک سرسید، تحریک خاکسار، تحریک مسلم لیگ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان تمام تحریکوں سے خاصا سماجی اصلاح کا کام کیا گیا، خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کر کے قوم کی صحیح رہنمائی کی۔ مولانا نے قرآن کا فارسی ترجمہ کر کے لوگوں کو ان کے دستور حیات سے واقف کرایا۔ حدیث کی تعلیم عام کی، سوسائٹی کی تشکیل و رہنمائی کے لیے "حجۃ اللہ البالغہ" لکھی۔ معاشرے کی ناہمواریوں کا قلع قمع کرنے کے لیے اعتدال کی راہ پیدا کی، ذات پات اور فرقہ بندی کا خاتمہ کیا۔

مولانا نے ان تمام رسوم اور برائیوں کا انسداد کیا جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلم معاشرے میں پیدا ہونے لگی تھیں اس سلسلے میں ایک کتاب "تفہیماتِ الٰہیہ" لکھ کر سماجی اصلاح کی۔ ۲۹

ان تحریکات کے باوجود بھی سماجی اصلاح کی تشنگی برقرار تھی، مسلمان بدعات و خرافات میں مبتلا تھے، مگر ایسے ماحول میں سرسیدؒ جیسا عظیم رہنما مل گیا، جس نے زوال پزیر تہذیب کا باطنی جائزہ لینے کے بعد انگریزوں کی ملازمت میں رہتے ہوئے نئے نئے علوم سیکھے تھے، بین الاقوامی سطح پر دنیا کی ترقی جس مقام پر پہنچ گئی تھی، اسے خوب اچھی طرح سمجھا تھا، یہ وہ وقت تھا جب صدیوں کی تہذیب دم توڑ رہی تھی، ایسے ناگفتہ بہ حالات میں سرسید نے سماجی رہنمائی کے لیے میدان عمل میں قدم رکھا اور اپنے چند رفیقوں کے ساتھ آگے بڑھ کر اپنی منظم اصلاحی سرگرمیوں سے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلمانوں کو بچالیا۔

سماجی اصلاح کے لیے سرسید نے ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۴ء میں مرادآباد اور غازی پور

میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مدارس قائم کیے اور ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد تمام زبانوں کی علمی وفنی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ ۳۰ع

۱۸۶۶ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا جس میں سماجی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس سے اصلاحی کوششوں میں بڑی مدد ملی۔ اس اخبار کا ایک کالم اردو اور ایک کالم انگریزی میں ہوتا تھا، اس کا خاص مقصد حکومت اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے خیالات وحالات سے آگاہ کرنا تھا۔ ۳۱ع

اسی طرح ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس کی پہلی اشاعت میں ہی انھوں نے اس کا مقصد بھی بیان کر دیا، جو درج ذیل ہے:

> ''اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سیولائزیشن تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے سیویلائزڈ یعنی غیر مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلائیں''۔ ۳۲ع

غرض یہ کہ سرسید احمدؒ نے مذہب و دین داری کو جدید علوم اور جدید تہذیب سے ملا کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کیا، انھوں نے مراسم کی زنجیریں توڑ کر نئے آئینِ تہذیب وتمدن مرتب کیے، اسکول اور کالج قائم کر کے مسلمانوں کے افلاس کو دور کیا اور انھیں باعزت زندگی عطا کی۔ اور وہ حقوق وتحفظ عطا کیے جو چھینے جا چکے تھے۔

چند نمایاں نام ان حضرات کے بھی ہیں جنھوں نے سماجی اصلاح کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی، جن میں مولانا مودودیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر اقبالؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، فضل حق خیرآبادی، شبلی نعمانی وغیرہ ہیں۔ ان حضرات نے بدعات ورسوم کی اصلاح، عقائد کی درستگی، تبلیغ دین، فرق ضالہ سے مناظرہ وغیرہ میں کوششیں کیں۔ ان کی جدوجہد لائقِ تحسین ہیں۔ ۳۳ع

اسی طرح سے معاشرے میں کچھ اور جاہلانہ رسمیں تھیں جیسے قبر پرستی، مریدی، تعویذ گنڈوں کا غلط تصور، نسل پرستی، نجومیوں اور ساحروں کا زور، شگون وبدفالی، بہت سی ایسی خرابیاں تھیں جن میں سماج ملوث تھا، ان تمام بیماریوں کا سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید نے قلع قمع کیا۔

مولانا مودودیؒ نے عدل وانصاف اور مساوات کا سبق سکھایا، خدائے واحد کی

وحدانیت کا اعلان کر کے لوگوں کو دعوتِ دین کی طرف راغب کیا اور اپنی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' لکھ کر باطل عقائد کو درست کیا، ترجمان القرآن کے ذریعے گمراہیوں، بے راہ رویوں سے آگاہ کیا اور ''پردہ'' کے ذریعے بھی سماج میں پھیلی بے پردگی کو دور کیا۔ تعلیم کا رجحان پیدا کر کے مغربی تعلیم کی اندھی تقلید کا خاتمہ کیا۔

ڈاکٹر اقبالؒ نے بھی اصلاحی کام کیا، انھوں نے فقہ اسلامی کی تشکیل و تدوین کی کوششیں کیں جن کے لیے انھوں نے سید سلیمان ندویؒ کی مدد لی۔ انھیں ایک خط لکھا جس کی تحریر اس طرح ہے۔

''اس وقت سخت ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، لیکن موجودہ دور میں آپ کے سوا یہ کام کون کرے گا''۔[۳۴]

ڈاکٹر اقبالؒ کا قابل فخر کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے جاہلی افکار پر تنقیدیں کیں اور قوی دلائل سے انھیں باطل ثابت کیا۔ ذہنی و فکری میدان میں اسلام کی حقانیت کی تعلیم دے کر توحید کی تعلیمات کو آگے بڑھایا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، لہٰذا ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کس طرح اس ظلم سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو تصنیفی و تالیفی کاموں میں لگا کر مسلمانوں کی مدد کی، انھوں نے اس سلگتے ہوئے ماحول میں ایسی نادر و نایاب کتابیں تالیف کیں جن سے قوم کے افسردہ اور پژمردہ دلوں میں تازگی، جوش و ولولہ پیدا ہوا۔

مولانا کی تصانیف میں سیرت النبیؐ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' ''المامون'' ''سیرۃ النعمان'' اور ''الفاروق'' بے مثال ہیں۔ انھوں نے جدید تعلیم پر زور دیا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' خود ایک سماجی تحریک تھا، جس نے طوفان حوادث میں اسلامیان عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا۔ مولانا نے الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کے تقلیدی رجحانات کا نقد و احتساب کیا، قرآن کی من مانی تاویلات کے ذریعہ امت کے نوجوان طبقہ کو جس طرح بہکایا جا رہا تھا اس پر کاری ضرب لگائی اور جدید تعلیم کی خرابیوں، الحاد و دہریت کی زہرناکیوں اور مذہب بیزاری کے مضر اثرات سے عوام کو متنبہ کیا۔

علمی حالات

ہندوستان کی سرزمین کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے ایسی ایسی یگانہ روزگار شخصیتوں کو جنم دیا جنھوں نے اپنی علمی کاوشوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور اور روشن کیا۔ اس خاک کے خزف ریزے بھی درِّ نایاب کی طرح روشن ہوئے اور اس سرزمین پر ایسے تابناک اور درخشندہ علمی ستارے جگمگائے کہ جن کی ضیاءِ علم نے نہ صرف یہ کہ تاریخ کے صفحات کو روشن کیا بلکہ علم وتحقیق کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور ان کو سیاسی، سماجی اور علمی اعتبار سے کمزور اور تباہ وبرباد کیا۔ حالات یہ ہوئے کہ ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب میں دہلی اجڑ گئی اور اس کی سیاسی بساط کے ساتھ علمی مرکزیت بھی ختم ہوگئی۔ دہلی جو کبھی علم ودانش کا چمن تھی، جہاں ہر طرف علمی فضا قائم ودائم تھی، معدوم ہوگئی۔ علماء کرام وہاں سے رختِ سفر باندھ کر ادھر ادھر جانے پر مجبور ہوگئے حتی کہ انھیں اپنی مسندِ درس بھی چھوڑنا پڑا۔

اجتماعی طور پر مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور انگریزوں کے قائم کردہ نظامِ تعلیم سے مسلمان مطمئن نہیں تھے، اس دورِ فتن میں علمی ترقی کے لیے کئی علمی اور ثقافتی تحریکوں کا آغاز ہوا، جس میں تحریک دیوبند، تحریکِ علی گڑھ، تحریک ندوہ اور تحریک جامعہ ملیہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

تحریکِ دیوبند

۱۸۵۷ء کے بعد جب کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ہندوستان تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا، لال قلعہ پر اسلامی پرچم کے بجائے یونین جیک لہرا رہا تھا[۳۵] اور کھلے عام عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ دہلی اجڑ چکی تھی، مدارس ویران ہو چکے تھے[۳۶] جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اقتصادی وعلمی پریشانیاں لاحق تھیں۔ مسلمان مایوسی وقنوطیت کے ماحول میں ہچکولے لے رہے تھے، ایسے تاریک دور میں جنگ آزادی کی ناکامی کے دس سال بعد ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی تاسیس ہوئی۔[۳۷]

مشہور ہے کہ دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، اسی وجہ سے وہاں کے فارغین قاسمی کہلاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے حاجی سید عابد حسین قادری کو اس کا اصل بانی قرار دیا ہے۔ اس ادارے کا اصل مقصد ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی تھا۔[۳۷] اسی کے ساتھ بقاء اسلام اور تحفظ علم دین اس مدرسہ کا بنیادی مطمح نظر تھا۔[۳۸]

درحقیقت مدرسہ دار العلوم دیوبند ہندوستان میں صرف تعلیمی مرکز نہیں تھا، بلکہ اسے بہت سی دینی تحریکات کا سرچشمہ ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ اس کے قیام نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور فضلائے دار العلوم نے ایسے نازک دور میں دینی خدمات انجام دیں ہیں جب کہ اس وقت دین اور تعلیم کا تصور ختم ہو رہا تھا۔ صرف انگریزوں کے قائم کردہ اسکول باقی تھے، جو طلباء کو زبردستی عیسائی بناتے یا دین سے بیزار کرتے۔ اس مدرسے نے ان حالات میں صحیح رہبری کی اور پورے ملک میں دینی فضا قائم کی۔

۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد لندن پارلیمنٹ ہاؤس میں دار العلوم کو بند کرنے کی تجویز پیش ہوئی، لیکن مشیتِ ایزدی کے آگے کسی کی نہ چلی، یعنی دار العلوم دیوبند انگریزوں کی خواہش کے باوجود بھی بند نہ ہو سکا۔[۳۹]

بلکہ ملک کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر اس کی شاخیں قائم ہیں، مثلاً مرادآباد میں مدرسہ شاہی، دربھنگہ میں مدرسہ امدادیہ، مئوناتھ بھنجن میں مدرسہ مفتاح العلوم وغیرہ اور اسی طرح اہل حدیث کے مدارس بھی اسی طرز پر قائم ہوئے مدرسہ سلفیہ بنارس، مدرسہ رحمانی دہلی، وغیرہ۔ ان تمام مدارس سے ہزاروں کی تعداد میں علماء فضلاء نکلتے ہیں اور علم دین کی اشاعت میں بڑی تندہی سے کام کرتے ہیں۔ ان مدارس کے فضلاء اور ان سے وابستگان کی خدمت بے بہا اور عدیم النظیر ہیں۔

تحریکِ علی گڑھ

اس تحریک کے بانی انیسویں صدی کے ممتاز مجاہد سر سید احمد خان ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۸۷۵ء میں ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' قائم کیا، جس کا افتتاح سر ولیم میور نے کیا۔[۴۰]

اس کالج کے سب سے پہلے بانی اور منتظم مولوی سمیع اللہ صاحب ہیں۔ جس

وقت کالج کا افتتاح ہوا تھا اس وقت سر سید بنارس میں تھے، چنانچہ مولوی سمیع اللہ نے کالج کے ابتدائی دور میں بڑی محنت کی، ان کے بعد سر سید نے تن من دھن کی بازی لگا کر اپنے خون پسینے سے اس کالج کو سینچا، تب کہیں کالج نے ۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔[۴۱]

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت زیروزبر تھی، اس لیے سر سیدؒ نے تحریک علی گڑھ چلائی، جس کا مقصد مسلمانانِ ہند کو مایوسی و قنوطیت سے نکال کر نئی زندگی سے روشناس کرانا تھا۔ مسلمان چونکہ اقتصادی اعتبار سے کمزور تھے، اس لیے سرکاری ملازمتوں سے بھی محروم ہو گئے تھے، مگر سر سیدؒ نے علی گڑھ کالج قائم کر کے اس کا سدِ باب کیا اور کالج میں اعلیٰ و معیاری تعلیم کا نظم کیا۔ اس کے علاوہ یورپین اسٹاف کو اپنی تعلیمی اسکیم کا جزء لاینفک بنا کر حکومت اور مسلمانوں کے درمیان حائل دیوار کو منہدم کرنے کی کوشش کی۔

سر سیدؒ کو اپنے مقصد میں کامیابی ملی، کیونکہ اس یونیورسٹی نے پسماندگی کی طرف تیزی سے ڈھلکنے والے مسلم معاشرہ کو کافی حد تک سنبھالا اور اسے حیات نو عطا کی۔ تقریباً کالج کے سبھی فارغ التحصیل طلباء کو سرکاری ملازمتیں ملنے لگیں اور مختلف مقامات پر یہ طلباء قومی کاموں کے مرکز بھی بن گئے اور علی گڑھ قومی، تعلیمی، ادبی، اجتماعی اور اصلاحی مرکز بن گیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

> ''علی گڑھ یونیورسٹی کے فضلاء نے مسلمانوں کی زندگی کے ارتقاء اور ملک کی سیاست میں مؤثر کردار ادا کیا ہے اور اسی یونیورسٹی سے ہندو قومی تحریک کے بالمقابل مسلم قومی تحریک کا آغاز ہوتا ہے''۔[۴۲]

اسی یونیورسٹی سے لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں نے فائدہ اٹھایا، جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خواجہ عبدالمجید، تصدق احمد خاں شیروانی، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔ یہ وہ قومی لیڈر تھے جنھوں نے عوام اور ملک دونوں کو فائدہ پہنچایا، اس کے علاوہ علامہ فراہی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، محسن الملک، وقار الملک، مولوی سمیع اللہ اور چراغ علی نے اس کالج کی مدتوں خدمت کی۔

درحقیقت علی گڑھ تحریک صرف سیاسی اور تعلیمی ہی نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی تحریک بھی تھی۔[۴۳] سر سید نے اسے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح

کے لیے قائم کیا تھا، مگر اس کی وسعت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی تنگ نظری کو ختم کر کے ان میں خوداعتمادی اور خیالات میں وسعت پیدا کی اور مسلمانوں کی نئی نسل میں علوم جدید اور انگریزی زبان کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

تحریک ندوۃ العلماء

ہندوستان کی ایک اہم تعلیمی تحریک اور عظیم درس گاہ ''ندوۃ العلماء'' ہے، جس کا قیام ۱۸۹۴ء میں عمل میں آیا۔ یہ ایک اہم تعلیمی تحریک تھی، اس کو ترقی دینے میں مولانا محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی نعمانی پیش پیش تھے۔ اس تحریک کے بھی چند مقاصد تھے۔

(۱)۔ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب واخلاق اور شائستگی واطوار۔

(۲)۔ علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کے رد وکد کا پورا انسداد۔

(۳)۔ عام مسلمانوں کی صلاح وفلاح اور اس کی تدبیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدگی۔

(۴)۔ ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم وفنون کے علاوہ علمی صنائع کی بھی تعلیم ہو۔[۴۴]

ندوہ کے قیام کا مقصد علی گڑھ اور دیوبند کو ملانا بھی تھا، اس کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے، مگر اس کی تکمیل مولانا محمد علی مونگیری نے کی اور اسے ترقی دینے والوں میں سب سے نمایاں علامہ شبلی نعمانی ہیں اور اس کے قابل فخر فرزندوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، سید نجیب اشرف اور مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور خداداد صلاحیت سے کامرانی و کامیابی کی منزلیں طے کیں اور ندوہ کا نام روشن کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ندوہ کی دعوت قدیم صالح اور جدید نافع کا حسین امتزاج تھی۔[۴۵]

اس ادارے نے لٹریچر کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ایسے افراد پیدا کیے جو تحریر وتقریر کی بہترین صلاحیتوں سے مزین تھے اور اسی ادارے نے اسلامی تہذیب وتمدن پر بیش بہا کتابیں مہیا کیں جن سے قوم میں بیداری آئی۔

علامہ شبلی نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں دارالعلوم ندوہ میں ہندی اور سنسکرت

زبانیں جاری کرائیں، جس کا مقصد تھا کہ مدرسہ کے طلباء ان زبانوں کے ذریعے آریوں کا مقابلہ کرسکیں گے۔ جن کا زور اس زمانے میں بہت بڑھا ہوا تھا، جو اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ندوہ میں انگریزی تعلیم بھی داخل نصاب ہوئی، تا کہ علماء اپنے علمی وقار کے ساتھ اپنے ملک اور غیر ملکوں میں بھی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فرض ادا کرسکیں۔ ۴۶

جامعہ ملیہ اسلامیہ

تمام تعلیمی اداروں میں سے ایک اہم اور معیاری ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں محمد علی جوہر نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ ڈالی۔ اس زمانے میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں شباب پر تھیں۔ اس دوران قوم کے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ اور سرکاری تعلقات سے آزاد کرانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ۴۷

یوں تو جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں پڑی، مگر ۱۹۲۵ء کو یہ ادارہ دہلی منتقل ہوگیا، جہاں حکیم اجمل اور ڈاکٹر محمد احمد انصاری مرحوم کی مدد اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کی انتظامی قابلیت اور حسنِ تدبیر سے یہ ادارہ ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ ۴۸

جامعہ کے قیام اور استحکام میں سب سے اہم کردار مولانا محمد علی جوہر کا ہے، جنھوں نے اپنی کوشش پیہم اور جہد مسلسل سے اس مشکل کام کو انجام دیا۔ مولانا محمد علی خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہی پروردہ تھے، ان کا اپنا بیان ہے کہ "میں نے جو کچھ سیکھا یا جو کچھ حاصل کیا وہ اسی علی گڑھ کا طفیل ہے"۔ ۴۹

درحقیقت جامعہ اپنے تعلیمی معیار و وقار کے علاوہ کچھ خاص صفات کا بھی متحمل ہے۔ اس کی پہلی صفت اساتذہ کا ایثار و قربانی ہے اور دوسری خصوصیت اساتذہ اور طلباء کی سادہ زندگی ہے۔ تیسری اہم خصوصیت صنعت و حرفت کی تعلیم ہے۔ کیونکہ جامعہ نے سرکاری ملازمت کو ہی اپنے طلباء کا نصب العین نہیں بنایا بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کا بھی معقول انتظام کیا، تا کہ وہاں کے فارغین بغیر دوسروں کی محتاجی کے اپنی زندگی بہتر طریقے سے گذار سکیں۔

جامعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے شروع ہی سے اشاعتی ادارہ قائم کیا جہاں سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں، اس کے ارباب اقتدار میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر

عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر مشیر الحق کو کافی مقبولیت وشہرت ملی۔

ان تمام علمی تحریکوں سے ملک کے گوشے گوشے میں علمی فضاء قائم ہوئی اور ہر مذہب وملت کے لوگ اس سے سیراب ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی کے بعد مسلمان مایوس اور افسردہ ہو گئے تھے۔ ان کے اندر عزم وحوصلہ کی ایک لہر پیدا ہوگئی۔

مسلمانوں اور علماء کی مدد سے کئی ایک مدارس قائم کیئے گئے، جس سے عام وخاص سبھی مستفیض ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۹ء میں سرائے میر اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ڈالی گئی جسے علامہ فراہی اور مولانا شبلی نے اپنی تمام تر علمی صلاحیتوں سے پروان چڑھایا۔ اس مدرسہ میں تفسیر قرآن اور فہم قرآن پر خصوصی توجہ دی گئی، عربی ادب کو کافی پروان چڑھایا۔ تحریک اسلامی کو اس سے کافی تقویت ملی اور اس مدرسے سے بڑی تعداد میں اسلام کے بہترین سپاہی نکلے۔

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ انھیں تحریکات کے سرچشموں میں سے ایک ہے۔ اس کا بھی مقصد وہی ہے جو اور تعلیمی تحریکوں کا ہے۔ یعنی قرآن وسنت پر گہرا علم، صحیح دینی بصیرت، وقت کے اہم مسائل اور غیر اسلامی نظریات سے بخوبی واقفیت اور اعلائے کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ اور گروہی و جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعتِ قلب کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وغیرہ۔

اسی طرح اور بعض مدارس اور اسکول وکالج قائم کیے گئے۔ جن سے علوم فنون میں ترقی ہوئی اور ہماری قوم جو عرصے سے اپنا علمی وقار کھو چکی تھی، اسے دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ان علوم اسلامیہ کی شاخ سے ایسے علماء وفضلاء اور دانش ور نکلے جنھوں نے اپنی ذہانت وفطانت، دانائی اور جدّت وعبقریت کے بے شمار نمونے پیش کیے۔ خصوصاً حدیث، فقہ، تفسیر اور تاریخ کے میدانوں میں ان کے کارنامے بہت نمایاں ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا امین احسن اصلاحی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا انور شاہ کشمیری، سید سلیمان ندوی، عبد الماجد دریابادی، حسرت موہانی وغیرہ اسی علوم اسلامیہ کے شاخ گل سرسبد ہیں۔ انھوں نے اپنی سعی وجہد اور پوری قابلیت وصلاح سے بہت سی تصانیف لکھ کر ہند اور بیرون ہند میں داد وتحسین حاصل کی۔

اسی طرح مولانا حمید الدین فراہی اپنے زمانے کے مفسر، مایہ ناز محقق اور بلند پایہ مجدد تھے۔ انھوں نے سب سے اہم کام قرآن پاک کی تفسیر لکھ کر کیا۔ مولانا نے اس دور میں قرآن کی تفسیر لکھی جب کہ لوگ سرسید کی من مانی تاویلات کا شکار ہو رہے تھے۔ تو مولانا فراہی نے ان تاویلات کی تردید کر کے قرآن کے صحیح اصول دریافت کیے۔

مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) ایک بلند پایہ عالم، عصر حاضر کے عظیم روحانی پیشوا اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ جن کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہیں۔ ان میں تفسیر بیان القرآن (۸ جلدوں میں)۔ بہشتی زیور، التعرف الی تصوف، بہشتی گوہر، حیات المسلمین، اصلاح الرسوم، تجوید القرآن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) ایک زبردست عالم دین، عظیم ادیب، بہترین مصنف، تھے۔ ان کی تصانیف بے نظیر و بے مثال ہیں۔ ان کی چند تصانیف درج ذیل ہیں:

لغاتِ جدیدہ، ارض القرآن (دو جلدوں میں) عربوں کی جہاز رانی، عرب و ہند کے تعلقات، سیرت عائشہ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح بے شمار علماء کی تصنیفی و علمی خدمات ہیں جن سے تعلیم و تعلم میں اضافہ ہوا اور ہر خاص و عام اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

خود مبارک پور میں بھی متعدد مدارس تھے اور علوم دینیہ کی طرف بڑی توجہ تھی اسی وجہ سے مدرسین، مصنفین اور حفاظ کرام کی کثرت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔

لیکن جیسے جیسے علمی تحریک میں اضافہ ہو رہا تھا ویسے ہی نئے فتنے بھی وجود میں آرہے تھے۔ کہیں شیعیت کا زور تھا تو کہیں غیر مقلدیت کا۔ کہیں وہابیوں کے فتنے تھے تو کہیں دیوبندیوں کا غلغلہ اور کہیں حنفی مسلک کا اختلاف تو کہیں شافعی مسلکے کا احتجاج، غرضیکہ بہت سی جماعتیں تیار ہوئیں اور انھوں نے اپنے اپنے مسلک پر زور دینا شروع کر دیا۔

ایسے حالات اور ماحول میں قاضی اطہر مبارک پوری نے آنکھیں کھولیں اور اپنی زندگی کے شب و روز گذارے اور اس ماحول سے ان کی ذات پر بھی کافی اثر پڑا۔ مگر مولانا نے سیاست سے دور رہ کر سماجی و علمی کام کے لیے کافی تگ و دو کی۔ یہی محنت شاقہ آگے چل کر ان کے لیے علمی جلالت کی علامت بنی، جو ان کی حیات کے گوشوں سے واضح ہے۔

حوالے

۱۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مطبوعہ ندوۃ المصنفین، دہلی، ص ۲۶۹، ۱۹۶۴ء

۲۔ ہاشمی فرید آبادی، تاریخِ ہند، ص ۱۱۷، ۱۹۲۲ء

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، انجمن ترقی اردو، دہلی، ص ۱۹۹، ۱۹۸۰ء

۴۔ مولانا اسیر ادروی، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار، آزاد پریس، دیوبند، ص ۲۰، ۱۹۸۱ء

۵۔ منشی محمد امین زبیری، سیاستِ ملیہ، عزیزہ پریس آگرہ، ص ۱۵۷، ۱۹۴۱ء

۶۔ رئیس احمد جعفری، علی برادران، ص ۲۲۸، ۱۹۶۳ء

۷۔ حکیم محمد اسحٰق، مرتب ڈاکٹر شعیب، پروانۂ چرغ، فرار خود یم ما، جمال پریس، دہلی، ص ۴۰، ۱۹۷۵ء

۸۔ شاہ معین الدین، حیاتِ سلیمان، دارالمصنفین، ص ۲۱۷، ۱۹۷۳ء

۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ (مقدمہ)، مرتبہ: فضل الدین احمد، پاکستان ٹائمز، لاہور، ص ۷-۸، ۱۹۱۹ء

۱۰۔ عبدالقدوس ہاشمی، پاکستان اور ہندوستان، دارالاشاعت حیدر آباد، ص ۸۳، ۱۹۴۱ء

۱۱۔ ڈاکٹر عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، یونین پریس، دہلی، ص ۱۶۲، ۱۹۶۵ء

۱۲۔ عبداللہ قدسی، آزادی کی تحریکیں، طبع اوّل، مطبع کمبائن پرنٹر، لاہور، ص ۶۶۲، ۱۹۸۸ء

۱۳۔ منشی محمد امین زبیری، سیاستِ ملیہ، عزیزہ پریس آگرہ، ص ۹۷، ۱۹۴۱ء

۱۴۔ امین زبیری، مسلمانانِ ہندی کی سیاستِ وطنی، ص ۵۹، بدون سن

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ قاضی عبدالغفار، حیات اجمل، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ص ۲۰۲، ۱۹۵۰ء

۱۷۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، یونین پریس، دہلی، بار اوّل، ص۱۳۳، ۱۹۶۵ء

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۲۰۔ ڈاکٹر ابوسلیمان شاہجہاں پوری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی - ایک سیاسی مطالعہ، ص ۱۳۰، ۲۰۰۱ء

۲۱۔ اسیر ادروی، تاریخ جمعیۃ علماء ہند، محبوب پریس دیوبند، ص ۵۶-۵۷، ۱۹۴۳ء

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۹۷

۲۴۔ جعفر حسین، ہندوستانی سماجیات، انجمن ترقی اردو ہند، بار اوّل ص ۱۲۵، ۱۹۵۵ء

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۲۶۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں (مقدمہ)، یونین پرنٹنگ پریس دہلی، ص ۹، بار اول ۱۹۶۵ء

۲۷۔ ڈاکٹر عبداللہ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۲، ص ۱۱۸،

۲۸۔ محمد عمرالدین (مضمون: علی گڑھ تحریک)، سرسید کا یا مذہبی طرز فکر، ص ۱۱۷، ۱۹۶۰ء

۲۹۔ عبیداللہ قدسی، آزادی کی تحریکیں، مطبع کمبائن پرنٹرز، لاہور، ص ۶۳ تا ۷۷، طبع اول ۱۹۸۸ء

۳۰۔ اصغر عباس، سرسید کی اردو صحافت، انجمن ترقی اردو ہند، ص ۵۷، ۱۹۷۵ء

۳۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حالی اکیڈمی، پنجاب ادبی منزل، لاہور، ص ۱۱۳، ۱۹۵۷ء

۳۲۔ عبیداللہ قدسی، آزادی کی تحریکیں، مطبع کمبائن پرنٹرز لاہور، ص ۲۶۲، طبع اول ۱۹۸۸ء

۳۳۔ اقبال نامہ، مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، جلد اول، ص ۱۴۴

۳۴۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ہندوستانی مسلمان، مجلسِ تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ص ۱۸، ۱۹۶۱ء

۳۵۔ مولانا سید محمد میاں، علماءِ ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم، ص ۱۶۱، ۱۹۸۵ء

۳۶۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، ص ۱۷، ۱۹۵۹ء

۳۷۔ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ادارہ اہتمام، دارالعلوم دیوبند، ص ۱۵۵، ۱۹۷۷ء

۳۸۔ مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، دفتر دارالعلوم دیوبند، سہارن پور، ج ۲، ص ۲۲۶، ۱۹۵۵ء

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۲۳-۲۲۴

۴۰۔ انوار الحسن شیرکوٹی، حیاتِ امداد، طبع اول، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن، کراچی، ص ۱۸، ۱۹۶۵ء

۴۱۔ شیخ اکرام، موجِ کوثر، فیروز سنز لاہور، ص ۸۸، ۱۹۵۸ء

۴۲۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، المسلمون فی الہند، المجمع الاسلامی العلمی ندوۃ، لکھنؤ، ص ۱۱۱، ۱۹۹۸ء

۴۳۔ ڈاکٹر عبداللہ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۲، ص ۱۱۸

۴۴۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، فیروز سنز لاہور، ص ۱۸۷، ۱۹۵۸ء

۴۵۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ص ۷۵، بدون سن

۴۶۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبع ثانی، ص ۱۵۳، ۱۹۷۰ء

۴۷۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، فیروز سنز لاہور، ص ۱۴۵، ۱۹۵۸ء

۴۸۔ عبدالغفار، جامعہ کی کہانی، مکتبہ جامعہ نگر، نئی دہلی، ص ۱۹-۲۰، ۱۹۶۵ء

۴۹۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ص ۱۵۳، ۱۹۵۸ء

باب دوم

حالاتِ زندگی
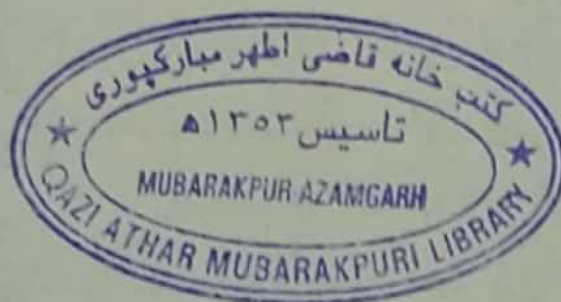
وطن مالوف اعظم گڑھ

اعظم گڑھ دولفظوں سے مرکب ہے۔''اعظم''اور''گڑھ''اعظم کے معنی''بڑا'' اور''گڑھ'' کے معنی''کھائی'' کے ہیں۔لفظ''گڑھ''سنسکرت کے لفظ''گدھ'' کی تبدیل شدہ شکل ہے۔اس کی تشریح مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس طرح کی ہے، لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جزء گڑھ ہے ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا، یعنی کسی رئیس یا زمین دار نے اپنے یا اپنی رعایا کے لیے کوئی گڑھ بنوایا اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کردیا ہو۔اعظم گڑھ بھی اسی قسم کا ایک شہر ہے''۔[1]

ابتداء میں''ضلع اعظم گڑھ''شیراز ہند جونپور کا ایک خطہ تھا، یہ علاقہ گھنے جنگلات پر مشتمل تھا، جو تارک الدنیا فقیروں، سنتوں اور سنیاسیوں کو اپنے اپنے طور طریقوں پر عبادت وریاضت کا کام دیتا تھا۔مگر مغلوں کے دور اقتدار ۱۶۶۵ء میں اسے بسایا گیا اور انگریزوں کے عہد حکومت میں ۱۸۳۲ء میں اسے مستقل ضلع کی حیثیت حاصل ہوئی۔[2]

اس ضلع کے بانی راجا اعظم خاں راجپوت راجاؤں میں سے تھے۔ان کے مورثِ اعلیٰ ابھیمان سنگھ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ابھیمان سنگھ نے شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں آگرہ جا کر اسلام قبول کیا، جہانگیر نے ان کی بڑی پزیرائی کی اور انھیں دولت خاں کے خطاب سے نوازا۔مینھ نگر سمیت ضلع اعظم گڑھ کے آس پاس کے چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی جس میں بیس پرگنے درج ذیل ہیں:

۱- نظام آباد
۲- کوڑیا
۳- تلہنی
۴- گوپال پور
۵- سگڑی
۶- محمد آباد
۷- گھوسی
۸- چکیسر
۹- نتھو پور
۱۰- چڑیا کوٹ
۱۱- مھتو پور
۱۲- بلہابانس

۱۳- دیوگاؤں	۱۴- مئوناتھ بھنجن
۱۵- شادی آباد	۱۶- بجری آباد
۱۷- پچھوتر	۱۸- سپہ پور تھری
۱۹- ظہور آباد	۲۰- بھواؤں

ان پرگنوں میں سے زیادہ تر اعظم گڑھ اور کچھ غازیپور میں شامل ہیں۔ اعظم گڑھ میں ''دولت پور'' قصبہ اسی راجہ ''دولت خاں'' کے نام سے منسوب ہے اور ان کی رانی کے نام پر ''سرائے رانی'' بھی موجود ہے۔[۳] یہ دونوں قصبے اعظم گڑھ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہیں۔

لیکن دولت خاں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ لاولد ہی مینھ نگر میں فوت ہو گئے۔ وہیں ان کی قبر ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہندو بھتیجہ ہربنس سنگھ کو ریاست کا مالک بنایا۔ ہربنس سنگھ کے اخلاف میں بکرماجیت نامی ایک نامور شخص تھا جس نے اسلام قبول کیا، اس کے دو بیٹے اعظم خاں اور عظمت خاں ہوئے جو اعظم گڑھ اور عظمت گڑھ کے بانی ہوئے۔[۴]

اعظم گڑھ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے میں راجپوت یا دوسرے نومسلم خاندان آباد ہیں اور دوسرے حصے میں وہ خاندان آباد ہیں، جن کے آباء واجداد نے دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کی اور یہاں آباد آ کر ہو گئے۔ اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو ملکی کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ''ملکیت'' والے، جاگیردار یا صاحب جائیداد کے ہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کو سلاطین وامراء کی طرف سے معافیاں اور جاگیریں ملتی رہیں۔ اسی مناسبت سے انھیں ملکی کہا جاتا ہے۔

نومسلم خاندان کی دو قسمیں ہیں جن میں سے ایک نسل بالکل خالص ہے یعنی راجپوت جو اسلام لانے کے بعد اسی طرح بغیر ملاوٹ کے ہیں اور دوسری نسل وہ ہے جو ایمان لائی اور اسلامی روایات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگی اس قوم کو عرف عام میں ''روتارا'' کہتے ہیں۔

بقول سید سلیمان ندوی ''روتارا'' حقیقت میں ہندی کے اصل لفظ ''راوت'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جسے پہلے راجپوتوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ مرہٹی میں 'راوت' سوار سپاہی کو کہتے ہیں اور وہ بہت سے خاندانوں کا سرنام ہے۔[۵]

ضلع اعظم گڑھ کے اصل باشندے آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مذہبی

نے ہند و بیرون ہند کو مختلف شکلوں میں متاثر کیا ہے۔ یعنی اس خطۂ ارض سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے جن کے کارناموں پر ملتِ اسلامیہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ اس ضلع کی علمی و دینی خدمات کو دیکھ کر ہی اقبال سہیل بے اختیار کہہ اٹھے

اس خطۂ اعظم گڑھ پر مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّر اعظم ہوتا ہے۔[9]

اقبال سہیل کا یہ شعر صداقت پر مبنی ہے۔ یہاں کے علماء، ادباء نے جو علمی، ادبی، تمدنی، تہذیبی، روحانی، تاریخی و سیاسی اور سماجی خدمات انجام دی ہیں وہ اہلِ علم کی نظروں سے مخفی نہیں۔

اس علم و دانش کے گہوارے کا ایک مشہور قصبہ مبارک پور ہے جو صنعت و حرفت کے لحاظ سے بہت مشہور ہے اور علمی و دینی اعتبار سے بھی ضرب المثل ہے۔ اس قصبے میں متعدد علماء، صلحاء، فقہاء، شعراء، ادباء پیدا ہوئے اور ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں انجمن تھا، ان کے تصنیفی و تالیفی کارنامے ہندوستان سے گذر کر عرب و عجم میں پھیلے۔

اور یہی قصبہ ''مبارک پور'' جامع ترمذی کی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن محدث (متوفی ۱۹۳۵ء)، شارح مشکوۃ المصابیح کے مصنف عبیداللہ رحمانی (متوفی ۱۹۹۳ء)، الرحیق المختوم کے مصنف مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری (متوفی ۲۰۰۶ء) شمس العلماء مولانا ظفر حسن (متوفی ۱۹۲۸ء)، مولانا احمد حسین مبارک پوری (متوفی ۱۹۴۰ء) مصنف سبیل الآخرت وغیرہم کا مسکن و مدفن بنا۔

اسی قصبے کے ایک روشن چشم و چراغ قاضی اطہر مبارک پوریؒ بھی تھے جو فہم و فراست، فکر و نظر، تفکّر و تدبّر اور عقل و دانش کے اعتبار سے ممتاز شخصیتوں میں نظر آتے ہیں۔

اطراف قصبہ مبارک پور

قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کے شمال اور مشرق کی طرف آٹھ میل پر واقع ہے۔ یہ کافی پرانا قصبہ ہے۔ سلطان نصیر الدین ہمایوں کے دورِ سلطنت (۱۵۳۰-۱۵۵۶ء) میں حضرت راجہ سید مبارک شاہ نے کڑا مانک پور (ضلع الٰہ آباد) سے آ کر ۹۶۳ھ میں اس قصبے کی بنیاد ڈالی۔

مبارک پور کا پرانا نام قاسم آباد تھا مگر یہ زوال و انحطاط سے کافی دوچار ہو چکا

تھا۔اسی کے کھنڈرات پر یہ قصبہ (مبارک پور) آباد ہوا۔اس قصبے میں پہلے زمانے میں بھی دس سے بارہ ہزار تک آبادی تھی۔جس میں ایک چوتھائی پارچہ باف مسلمان تھے اور کچھ دولت مند تاجر بھی جو اس قصبے کی شان تھے۔

اس قصبے کا طول البلد مشرق و مغرب میں ۸۳ درجہ ۱۸ دقیقہ ہے اور عرض البلد شمال و جنوب میں ۲۶ درجہ ۶ دقیقہ ہے۔یہ قصبہ اعظم گڑھ سے ایک پختہ سڑک کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔[۱۰]

اس میں ۲۸ محلے ہیں جن میں ۱۴ محلے خاص مبارک پور میں ہیں اور چودہ محلے اس کے اردگرد ہیں۔دراصل مبارک پور کی صنعتی آبادی کی وجہ سے دور ونزدیک کے مسلمان بھی آ کر آباد ہو گئے۔

اس قصبے کا تعلق علمی، دینی، تمدنی، معاشی اور تجارتی ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں یہاں کے ریشمی کپڑے برطانیہ اور عرب ممالک میں جایا کرتے تھے۔فنکارانِ مبارک پور کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ریشمی ساڑیوں کی چمک دمک اور اس کی خوب صورتی کی کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔اس کے علاوہ علم وفضل میں بھی اس نے اپنا ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور اس کے بالمقابل اعظم گڑھ کا کوئی دوسرا قصبہ نہیں ہے۔

مبارک پور کے علمی کارناموں اور اہلِ علم کی خدمات کو دیکھ کر علامہ سید محمود طرازی مدنیؔ نے اپنی منظوم تقریظ میں علم کی ڈالی سے تشبیہ دی ہے۔

بقيت مبارکفور یا العلم غضةً
فضائک بالانوار دوماً منور
فانک مهد العلم فی کل فترةٍ
فقیه جلیل من فناءک یظهر
وان لم یکن الا المؤلف وحدهٗ
کفاک وهندی منه لیس تنکر[۱۱]

اور قاضی صاحب اس قصبے کو نیشا پور ہند سے تعبیر کرتے ہیں۔[۱۲]

مبارک پور میں طویل عرصے سے حنفی مسلک کے لوگ آباد تھے، مگر بعد میں دوسرے مسالک کا بھی فروغ ہوا۔جیسے شیعی، اسماعیلی (بوہرہ) اور اہلِ حدیث وغیرہ۔اس

لیے مختلف مسالک و مذاہب کے لوگوں کی وجہ سے یہاں (مبارک پور میں) زبردست مسلکی اختلافات ہوئے، جس کے زیر اثر کئی مدارس کا وجود ہوا اور ہر مدرسہ اپنے اپنے نظریات وخیالات کے مطابق قائم ہوا۔

۱۔ مدرسہ ''احیاء العلوم'' دیوبندی نظریات وخیالات کے مطابق قائم ہوا۔

۲۔ مدرسہ ''مصباح العلوم'' بریلوی نقطۂ نظر کا حامل رہا۔ اوراب یہی مدرسہ ''مفتاح العلوم الجامعۃ الاشرفیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اوراپنی شہرت کے منازل طے کرنے میں کوشاں ہے۔

۳۔ ''باب العلم'' شیعی نظریات کے تحت قائم ہوا۔

۴۔ ''دارالتعلیم'' اہل حدیث نظریہ کی ترجمانی کرتا ہے۔

مبارک پور کے چاروں مدارس اپنی منفرد عالمانہ شان رکھتے ہیں۔ ان چاروں مدارس کے بارے میں قمرالزماں مبارک پوری فرماتے ہیں کہ: ''مبارک پور کی معاشرت کے یہی عناصر اربعہ ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے نظریات وعقائد پیدائش تا وقتِ مرگ انھیں چاروں محوروں کے گرد رقص کرتے ہیں۔۱۳

ایک زمانہ میں یہاں اہل بدعت کا زور تھا، گروہی عصبیت اور مسلکی تعصب کی وجہ سے معمولی باتیں بھی مخالف پارٹی کا مسئلہ بن کر جنگ وجدال کا سبب بن جاتی تھیں۔

مبارک پور کے اطراف وجوانب میں جو بستیاں ہیں ان کا بھی دینی، تجارتی، معاشی اور تمدنی تعلق اسی قصبہ سے ہے اس لیے ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ وہ مشہور آبادیاں درج ذیل ہیں:

(۱)	بِکھٹی	(۲)	سرائے مبارک
(۳)	مصطفیٰ آباد	(۴)	حسین آباد
(۵)	سریاں	(۶)	نوادہ
(۷)	رسول پور	(۸)	املو
(۹)	لوہیا	(۱۰)	چکیا
(۱۱)	اساوُر	(۱۲)	لہرا
(۱۳)	گجہرا	(۱۴)	فخرالدین پور

(۱۵) بمہور

ان بستیوں میں بھی بڑے بڑے مدارس ومکاتب تھے جن میں اعلیٰ پیمانے پر بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ کو مدرسہ حنفیہ جونپور یا مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور بھیجا جاتا تھا۔ ان مدارس کا تذکرہ مولانا محمد حسن الاعظمی مبارک پوری ازہریؒ نے اپنی کتاب "فتی الھند وقصة باکستان" کے صفحہ ۲۰-۲۲ پر کیا ہے۔ مگر شاید اب یہ کتاب ناپید ہے۔ قاضی صاحب تذکرہ علماء مبارک پور میں لکھتے ہیں کہ "افسوس کہ یہاں کے قدیم علماء وفضلاء کی طرح قدیم مدارس کے حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں"۔ [۱۴]

لیکن پھر بھی اس قصبے میں بہت سے قابل قدر علماء پیدا ہوئے جن میں تدریس و تعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا خاص ذوق بھی رہا اور انھوں نے اپنے علمی ودینی کارناموں سے دنیا کو معمور کیا۔

سلسلۂ نسب

قاضی اطہر مبارک پوری انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ قاضی اطہر بن الحاج شیخ محمد بن حسن، الحاج شیخ لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی شہید۔ مؤخر الذکر سے پہلے ان کا خاندان کڑا مانک پور (ضلع الہٰ آباد) میں رہتا تھا۔ خاندانی سلسلے سے متعلق صرف اتنا معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کے جدِ اعلیٰ علی شہید شہنشاہ ہمایوں کے دور سلطنت میں راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوری [۱۵] کے ہمراہ مبارک پور آئے اور پھر وہیں آباد ہو کر حکومت کی طرف سے نیابتِ قضا کا عہدہ سنبھالتے رہے۔

نام وولادت

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا اصلی نام عبدالحفیظ بن شیخ حاجی محمد حسن ہے، مگر خاندانی عہدۂ قضاء کی وجہ سے "قاضی" اور شعر وشاعری کے تخلص سے "اطہر" اور قصبے کی نسبت سے "مبارک پوری" مشہور ہوئے۔ اس کی طرف مشہور شاعر ایوب مبارک پوری نے یوں اشارہ کیا ہے:

شاعری کی بزم میں آکر سخنور ہوگئے
تھے کبھی عبدالحفیظ اب قاضی اطہر ہوگئے [۱۶]

۷ر مئی ۱۹۱۶ء کو صبح پانچ بجے قاضی صاحب کی ولادت ہوئی۔ آپ کی سنِ پیدائش

پر تمام تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے ۱۷ اور آپ کی خود نوشت سوانح میں اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ قاضی صاحب کی پیدائش مبارک پور محلّہ پورہ صوفی میں ہوئی، جس مکان میں ان کی پیدائش ہوئی وہ قاضی منزل کے نام سے مشہور ہے۔

نانیہال

مولانا کا نانیہال مبارک پور سے مشرق میں واقع موضع رسول پور میں ہے۔ ان کے نانا حکیم الحاج مولانا احمد حسین بن عبدالرحیم رسول پوری (۱۲۱۸ھ-۱۳۵۹ھ) بمطابق (۱۸۰۳-۱۹۴۰ء) اپنے دور کے بڑے قابل اور جامع صفات انسان تھے۔ تمام علوم وفنون میں ماہر، متبحر عالم اور اعلیٰ مدرس ومفتی، بہترین مصنف وطبیب ہونے کے ساتھ عربی کے ادیب اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد قاضی صاحب نے ۱۹۵۸ء میں ان کا شعری مجموعہ دیوانِ احمد کے نام سے شائع کرایا جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۸

مولانا احمد حسین صاحب نے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مدرسہ مظاہرالعلوم میں تعلیمی خدمت انجام دیں اور ۱۳۲۶ھ تک مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں عربی کا درس دیا۔ اس کے علاوہ مدرسہ حسینیہ ڈھاکہ پھر مدرسہ حمادیہ اور مدرسہ دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں اور مدرسہ ہوگلی میں بھی ایک سال تک صدر مدرس رہے۔ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں چھ سال تک صدر مدرس رہے۔ ۱۳۵۷ھ میں وہاں سے مستعفی ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۵۷ھ کا دور مسلسل درس وتدریس میں گذارا اور کثیر تعداد میں طلباء نے ان سے کسب فیض کیا۔ ۱۹

مولانا احمد حسین کی مطبوعہ تصانیف میں: تحفۃ الاحباء (اردو)، احسن المبرّات (اردو)، القلائد من الفرائد (فارسی) حاشیہ ملتقی الابحر (عربی)، حاشیہ قصیدہ (عربی)، سبیل الآخرت (اردو)، تجہیز الاموات (اردو)، مجرباتِ احمدی (اردو)، دیوان احمد، اشعار کا مجموعہ وغیرہ ہیں۔ ۲۰

مولانا مصنف ومدبر ہونے کے ساتھ کتابوں کے بھی بہت شوقین تھے اس لیے ان کے کتب خانہ میں عربی، اردو، فارسی کی متعدد کتابیں موجود تھیں۔ وہ کتابوں کی خریداری کے وقت ایک بات کا خاص طور پر دھیان دیتے کہ کتابوں کا کاغذ سفید، چکنا اور چمکدار نہ ہو، کیوں کہ اس سے آنکھ کی روشنی پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے کتب خانہ

میں کئی کتابیں سرخ اور ہرے رنگ کے کاغذ کی تھیں۔ ۲۱

قاضی صاحب کے نانا کے علاوہ نانی صاحبہ بھی نہایت نیک اور دین دار خاتون تھیں۔ یتیم بچے اور بچیوں کی پرورش و پرداخت کرتیں۔ محلے کے بچوں کو اپنے گھر بلا کر ان کی دینی تعلیم و تربیت کرتی تھیں۔ بچوں کے علاوہ بڑے بوڑھے بھی ان سے تعلیمی افادہ کرتے تھے۔ اس لیے مولانا کی نانی پورے گاؤں رسول پور میں ملانی چچی کے لقب سے مشہور تھیں۔ غرضیکہ قاضی صاحب کا ننہیال یتیموں، بے کسوں اور محتاجوں کا مسکن تھا اور وہاں غرباء کی شادی بیاہ اور دیگر ضروریات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس وقت مولانا کا ننہیال رسول پور کا پچاس سال تک واحد مدرسہ تھا اور اس کی معلمہ ان کی نانی رحیمہ بنت حافظ نظام الدین سریانوی تھیں۔

قاضی صاحب کے ماموں مولانا محمد یحییٰ (۱۹۱۰ء- ۱۹۶۷ء) نہایت ذہین و طباع اور صاحب استعداد عالم تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ معقولات میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی اور مناظرہ میں جامع کمالات تھے۔ علم ہیئت اور فلکیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس دیار میں یہ فن انھیں پر ختم ہوگیا۔ انھیں تحقیق و تصنیف سے خاصی دلچسپی تھی، عربی کے باکمال شاعر تھے، انھوں نے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور، عربی کالج رائیڈرک آندھرا پردیش اور مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں عرصۂ دراز تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۲۲ مولانا کے نانا کے بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم بھی مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں صدر مدرس رہے۔ یہ اعلیٰ درجے کے نطاط، خود اعتماد، زبردست عالم دین، عظیم مصنف اور بہترین مفکر و طبیب حاذق تھے۔ ۲۳

مختصر یہ کہ مولانا کا ننہیال علم و فضل میں کافی نمایاں تھا، جس کی بدولت انھیں بھی سازگار ماحول ملا اور ساتھ ہی علمی ذوق و شوق کو جلا بھی ملی۔ قاضی صاحب خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ: ''میرا علمی سرمایہ ننہیال کی دین ہے اور میں نے یہ دولت وہیں سے پائی ہے''۔ ۲۴

قاضی صاحب نے قاعدہ بغدادی میں اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: ''کہ نانا محترم بسلسلہ مدرسی اور ماموں بسلسلۂ تعلیم باہر رہتے تھے، میں ان کی عدم موجودگی میں ان کے کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابیں نکالتا تھا اور ان کو الٹتا پلٹتا، حالانکہ اس وقت کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی، بعض کتابوں میں نانا کے تعلیقات اور حواشی ہوتے تھے۔ ان کو بہت غور

سے دیکھتا تھا۔ وہیں سے مجھے اخذ واقتباس کا ذوق پیدا ہوا اور میں اپنی استعداد کے مطابق ان کے کاموں کی نقل کرنے لگا۔ اسی دور میں مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف کا رجحان پیدا ہوا"۔۲۵؎

عہد طفلی

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ بچپن کے شوق نرالے ہوتے ہیں، الٹی سیدھی چیزیں مثلاً کھلونے، ٹوٹے پھوٹے سامان، رنگ برنگی چیزیں، وغیرہ جمع کرنا بچوں کے مشغلے ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب کا طفلانہ ذوق بھی اسی طرح کا تھا۔ انھیں مختلف قسم کے سکّے، رنگ برنگے پھول، ٹکٹ (خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی) اور ماچس کی خالی ڈبیہ وغیرہ جمع کرنے کا شوق تھا۔

اس کے علاوہ اپنے خاندانی بھائیوں کے ساتھ مل کر سیر وشکار، کھیل کود، کھیت کھلیان میں جا کر شرارتیں کرنا اور کبوتر بازی کا شوق بھی شدید تھا۔ جس کی وجہ سے ایک بار مدرسہ سے غائب رہے اور ان کے والد صاحب نے انھیں مارا بھی۔ مگر ان کا یہ شوق طفلی دور تک ہی محدود تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ ذوق میں بھی تبدیلی آئی۔

قاضی کی وجہ تسمیہ

قاضی اطہر مبارک پوری خود قاضی نہیں تھے بلکہ ان کے خاندان میں نیابت قضاء کا عہدہ کافی عرصے تک رہا جس کی وجہ سے انھیں بھی قاضی کہا جانے لگا، یہاں تک کہ ان کی اولاد واحفاد کے نام کے آگے بھی لفظ قاضی لکھا جاتا ہے، گویا یہ بھی ان کے نام کا ایک جزء بن گیا ہو۔

انگریزوں کے آخری دور حکومت میں محکمۂ قضاء ایک اعزازی محکمہ تھا۔ اس وقت محمد آباد گوہنہ (یہ ضلع مئو کا مشہور اور تاریخی قصبہ ہے) دار القضاء تھا۔ یہاں کے قاضی القضاۃ مولانا محمد رؤف صاحب تھے۔ ان کے بعد محمد سلیم مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۶ھ قاضی ہوئے۔ ان کے بعد محمد شاہ عالم نے دار القضاء کا منصب سنبھالا۔ ان تینوں کا قاضیوں کی مسندِ قضاء قاضی اطہر صاحب کے جدِ اعلیٰ شیخ امام بخش کو ملی، مگر ان اسناد میں سے قاضی محمد رؤف کی مسندِ قضاء محفوظ نہ رہ سکی۔ البتہ محمد سلیم اور قاضی محمد شاہ عالم کی سندیں موجود ہیں۔ لہٰذا شیخ امام بخش کے زمانے سے یہ عہدہ قاضی صاحب کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چار پشتوں تک قائم رہا۔ سب سے آخر میں مولانا محمد حسین صاحب (محمد حسن کے بڑے بھائی) اس عہدے پر فائز ہوئے، انھوں نے نیابت قضا کی رہی سہی روایت کو بحسن وخوبی انجام دیا اور نکاح خوانی،

جمعہ وعیدین کی امامت وغیرہ کرتے رہے۔ اسی دوران آپ نے حج بیت اللہ بھی ادا کیا، مگر اس کے بعد بیمار رہنے لگے اس لیے صرف قصبے تک ہی اپنے کام کو باقی رکھا اور دیہاتوں کے لیے دوسرے لوگوں کو مقرر کردیا۔ مولانا محمد حسین کی طبیعت برابر ناساز رہی۔ آخر کار ۲۸رفروری ۱۹۷۸ء میں انتقال کر گئے۔ [۲۶]

مولانا قاضی محمد حسین کے بعد یہ سلسلہ انہی پر ختم ہوگیا مگر ابھی بھی اس خاندان کے اکثر افراد جو علم و دانش کی دولت سے سرفراز ہیں وہ وقتاً فوقتاً یہ کام انجام دیتے ہیں۔ ان قاضیوں کا کام پیش آنے والے وقتی مسائل کو حل کرنا، نکاح، طلاق، وراثت، اختلاف بین المسلمین کے قضایا اور اقامت وامامت، جمعہ وعیدین کے علاوہ اور بھی بہت سے مسائل وغیرہ کا حل کرنا تھا۔

ابتدائی تعلیم وتربیت

قاضی صاحب کی تعلیم وتربیت میں ان کی نانی رحیمہ بنت حافظ نظام الدین صاحبہ اور والدہ محترمہ کا بڑا دخل ہے۔ ان دونوں خاتون نے اپنی شفقت ومحبت اور دن رات کا آرام وچین قربان کر کے ان کی پرورش و پرداخت کی، صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں عابدہ زاہدہ خواتین کا دودھ بھی مولانا کے حلق میں پڑا۔ جس کے اثرات ان کے دل ودماغ پر مرتب ہوئے۔ قاضی صاحب نے اپنی خودنوشت ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''میری نانی مرحومہ رحیمہ بنت حافظ شاہ نظام الدین سریانویؒ متوفیہ ۲۶ رمضان ۱۳۷۸ھ بڑی نیک اور عابدہ زاہدہ خاتون تھیں۔ میں نے ان کا دودھ پیا ہے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں''۔ [۲۷]

قاضی صاحب کی تعلیم کی ابتداء ان کے گھر سے ہوئی، والدہ صاحبہ نے ہی انھیں قرآن پڑھنا سکھایا۔ کیونکہ قاضی صاحب کی والدہ محلّے کے بچوں کو گھر پر قرآن شریف پڑھایا کرتی تھیں، اس لیے مولانا نے بھی ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ اور تیسرا پارہ پڑھنے کے بعد وہ مدرسہ میں داخل کیے گئے۔

اس سے پہلے قاضی صاحب نے اپنے گھر پر ہی دینی وعلمی باتیں اپنی والدہ سے سیکھیں۔ نیز نماز کی پابندی بھی انھیں کی دین ہے۔ ان کا گھریلو ماحول سراسر دینی وعلمی تھا، جو ان کی شخصیت کے نکھار میں معاون ثابت ہوا۔

مزید تحصیل علم

ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا، وہاں انھوں نے محترم حافظ علی حسن سے قرآن عزیز کی تعلیم مکمل کی اور منشی عبدالوحید صاحب سے اردو کی تعلیم حاصل کی، ریاضی کا علم منشی اخلاق احمد صاحب متوفی ۱۴۰۴ھ سے سیکھا، مولانا نعمت اللہ صاحب متوفی ۱۳۶۲ھ فارسی کے استاد رہے اور انھیں سے اردو عربی کی خوشخطی بھی سیکھی، تقریباً پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے اردو و فارسی کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد عربی ادب کی طرف توجہ مبذول کی۔ دس سال عربی کی تعلیم میں صرف ہوئے۔

قاضی صاحب نے اسی مدرسے کے مولانا شکر اللہ صاحب متوفی ۱۳۶۱ھ سے منطق و فلسفہ میں مہارت حاصل کی اور مولانا محمد عمر صاحب سے تفسیر جلالین پڑھی۔ اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب متوفی ۱۳۸۷ھ سے عروض و قوافی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے۔ اس کے علاوہ صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ وغیرہ بھی اپنے ماموں سے ہی پڑھیں اور دیوانِ حماسہ، زمخشری (تفسیر) پر بھی فوقیت حاصل کی۔

قاضی صاحب نے ایک سال مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں مولانا سید محمد میاں متوفی ۱۳۹۲ھ سے کسبِ علم کیا وہاں انھوں نے سید محمد میاں سے سنن ترمذی، مولانا سید فخرالدین صاحب متوفی ۱۳۹۲ھ سے صحیح بخاری، سنن ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد کا درس لیا، مولانا محمد اسماعیل سنبھلی صاحب متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھی۔ یوں تو احادیث کا درس انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم میں حاصل کر لیا تھا، مراد آباد تو صرف دورۂ حدیث کی غرض سے گئے تھے، مگر موقع کی مناسبت سے انھوں نے وہاں پر مزید استفادہ کیا اور سندِ فراغت حاصل کی۔

مزید تعلیمی حصول کے بعد بھی قاضی صاحب کی تشنگی برقرار رہی، مگر افسوس کہ مولانا اپنی مالی پریشانیوں کی وجہ سے کسی دور دراز ممالک کی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکے اور ان کے شوق کی تکمیل نہ ہو سکی جس کا انھیں تاعمر افسوس رہا۔ جس کا اظہار انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ”میرے محدود وسائل اس بات کی اجازت نہ دیتے تھے کہ میں قرب و جوار کے بڑے بڑے مدرسوں میں تعلیم حاصل کروں۔ بڑی مشکل

سے ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا''۔ ۲۸

مزید لکھتے ہیں:

''تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کا سودا سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی۔ میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو ہی جامع ازھر، جامع زیتون، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ، مدرسہ مستنصریہ بنالیا اور وطن میں رہ کر خدا کے فضل وکرم اور اساتذہ کی شفقت ومحبت اور اپنی محنت وعزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا''۔ ۲۹

قاضی صاحب کی اس تحریر سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک چھوٹے قصبے کے مدرسہ سے علم حاصل کیا، اس دور میں قدیم طرز کے اساتذہ قدیم طریقے سے ہی تعلیم دیتے تھے۔ جب کہ تصنیف وتالیف کا اتنا رواج نہیں تھا جتنا کہ بیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا۔ لہٰذا قاضی صاحب نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ہی سب کچھ حاصل کیا اور قاضی صاحب کے اساتذہ محنت کرتے تھے اور محنت کرانے کے عادی تھے جس کی وجہ سے قاضی صاحب نے بھی محنت کرنا سیکھا، ان اساتذہ کے خلوص ومحبت نے انھیں بام عروج تک پہنچایا۔

ان کے اساتذہ طلبہ کی ہر طرح سے دلجوئی کرتے تھے۔ اس معاملے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ صدق دل سے شاگردوں کے کاموں اور کارناموں کو سراہتے اور حوصلہ افزائی کرتے، جس کی وجہ سے استاد و شاگرد کی محنت رنگ لائی اور قاضی صاحب نے اسی مدرسہ سے علم حاصل کر کے ملک و بیرونِ ملک میں اپنے نام کا سکہ جمایا۔ اسی وجہ سے فخریہ انداز میں لکھتے ہیں کہ ''طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق وشوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بھی بڑا ہو سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر بھی چھوٹا ہی رہے گا۔ ۳۰

اور اسی صفحے پر یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارہ کے سایہ میں جگہ ملتی تو میرا علمی پودا قوتِ نمو سے محروم ہو جاتا اور کھلی آب و ہوا میں اسے آزادانہ پھلنے

پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع میسر نہ ہوتا''۔۳۱

اساتذۂ کرام

مولانا قاضی صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے اپنے زمانہ کے گراں نمایاں اور بلند پایہ عالم اور باکمال شخصیتوں کے دامنِ علم وفضل سے کسبِ فیض کیا، انھوں نے جن اساتذۂ کرام سے شرف تلمذ حاصل کیا وہ اپنے زمانہ کے نابغہ و یکتا ہیں، چاہے ان کا تصنیفی ذوق رہا ہو یا نہ رہا ہو، لیکن ان کی علمی بلندی میں کمی نہیں تھی۔ قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''میرے اساتذہ کرام کتابیں نہیں کتابوں کے فن پڑھانے کے قائل تھے'' مولانا شکراللہ صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''انھوں نے مجھے نہایت ذوق ومحنت سے پڑھایا۔ میری ہمت افزائی اور ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے''۔۳۲

قاضی صاحب نے اپنے اساتذہ کے بارے میں فرداً فرداً تعریفی کلمات لکھے ہیں جس سے ان کے اساتذہ کرام کی علمی لیاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ ذیل میں قاضی صاحب کے چند اساتذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب

مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارک پور کے ایک معزز خاندان میں ۱۴ فروری ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے، ۳۳ انھوں نے ابتدائی تعلیم محلّے کے استادوں سے حاصل کی، تکمیل تعلیم کے لیے دیوبند تشریف لے گئے وہاں تین سال تک حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب اور منطق وغیرہ کا درس لیا، آپ نے دیوبند میں مولانا انور شاہ کشمیری، شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا اعزاز علی اور علامہ محمد ابراہیم صاحب سے کسبِ علم کیا اور پٹنہ جا کر تدریسی فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں پوری زندگی درس وتدریس کی خدمات میں گزار دی۔ سب سے پہلے عربی کے مدرس ہوئے، ناظم تعلیمات، رکنِ شوریٰ اور آخر عمر میں مفتی جامعہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔۳۴

اس کے علاوہ اکثر وبیشتر دور دراز ممالک سے فتوے آتے تو اس کا اطمینان بخش جواب دیتے۔ عرصہ تک رسالہ ''البلاغ'' ممبئی میں بھی آپ کا فتویٰ شائع ہوتا رہا۔ اس

معاملے میں محمد یٰسین صاحب کو بھی ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔[۳۵] مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب قاضی صاحب کے پہلے استاد ہیں جن سے انھوں نے عربی کے علاوہ دیگر کتابیں پڑھیں اور وقتاً فوقتاً درس وتدریس کے سلسلے میں بھی ان سے مدد حاصل کرتے رہے۔ ان کی مربیانہ ومعلمانہ عنایات کا حال یہ تھا کہ وہ طلباء پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ مفتی یٰسین صاحب نے ان کو مقامات حریری میں نمایاں کامیابی پر ایک روپیہ بطور انعام دیا تھا۔ قاضی صاحب اپنے تاثر کو یوں پیش کرتے ہیں کہ

> ''مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مدرسہ احیاء العلوم کے عربی اساتذہ میں میرے سب سے پہلے استاد ہیں، میں نے اکثر کتابیں انھیں سے پڑھیں ہیں۔ ان کی سادگی نیک نفسی اور خلوص سے مجھے بے حد فائدہ پہنچا ہے''۔[۳۶]

یوں تو مفتی صاحب کے تلامذہ کی کثیر تعداد ہے لیکن یہاں صرف شہرت یافتہ تلامذہ کا ذکر کیا جارہا ہے۔ مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیر آبادی (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا عبدالباری قاسمیؒ، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارک پوری، مولانا قمرالدین (استاد حدیث دارالعلوم دیوبند)، مولانا عبدالمنان (سابق شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم دیوبند) یہی وہ لوگ ہیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب نے پوری عمر درس وتدریس میں گذاری اور عمر کے آخری حصے میں بیمار رہنے لگے۔ کمزوری بڑھتی گئی آنکھوں کا آپریشن کرایا، مگر پھر بھی آرام نہ ہوسکا۔ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے، دوسرے دن تدفین عمل میں آئی علماء، فضلاء کا کثیر مجمع تھا حتیٰ کہ بریلوی خیال کے علماء بھی شریک جنازہ تھے۔ مولانا صدیق صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔[۳۷]

مولانا بشیر احمد صاحب

مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پور کے رہنے والے تھے، ان کی تاریخ ولادت کا علم نہ ہوسکا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ''فیض عام'' مئو سے حاصل کی اور ''مظاہر العلوم'' سہارن پور سے تعلیم کی تکمیل کی اور اپنی زندگی کے پچاس سال تدریسی کاموں میں صرف کیے، یہاں ان چند مدارس کا ذکر کیا جارہا ہے جن میں انھوں نے درس دیا تھا۔

(۱)مدرسہ معہد ملت مالیگاؤں　　(۲)مدرسہ حیات العلوم مراد آباد
(۳)مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور　　(۴)مرکزی دار العلوم محمدیہ گھوسی (مئو)

اس کے علاوہ مبارک پور میں نظامت کے فرائض بھی انجام دیے، ضعیفی کی وجہ سے کمزوری کا غلبہ ہوگیا اور ۳ جولائی ۱۹۸۴ء کو وفات پائی۔ مولانا حبیب الرحمٰن محدث نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ۳۸

مولانا عبدالوحید لاہر پوری صاحب

مولانا عبدالوحید صاحب کی پیدائش ضلع سیتا پور کے قصبے لاہر پور میں ہوئی، لیکن تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہوسکا۔

انھوں نے درس وتدریس کی وجہ سے مبارک پور میں مستقل سکونت اختیار کی اور زندگی کے آخری ایام تک وہیں مقیم رہے اور مدرسہ احیاء العلوم (مبارک پور) میں ریاضی اور اردو کی تعلیم دی۔ قاضی اطہر صاحب نے بھی ان سے خوب استفادہ کیا۔ خاص طور پر اردو میں انھیں سے مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ بہت سے طلباء نے ان سے کسب علم کیا، جو بعد میں علماء فضلاء کی صف میں شامل ہوئے۔ مولانا نے ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں مبارک پور میں ہی وفات پائی۔ ۳۹

مولانا نعمت اللہ صاحب

مولانا نعمت اللہ صاحب چودھویں صدی کے ابتداء میں پیدا ہوئے، قبل پیدائش ان کا خاندان ضلع مئو میں آباد تھا۔ مگر پھر ترک وطن کر کے مبارک پور میں سکونت اختیار کی اور مبارک پور میں انھیں بڑی خوش حالی نصیب ہوئی۔ مولانا نعمت اللہ صاحب نے قرآن کریم کی تعلیم گھر اور محلے کے ذریعے حاصل کی، پھر مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمود صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کانپور کے مدرسہ جامع العلوم گئے وہاں بھی تدریسی فریضہ انجام دیا اور وہاں سے استفادہ کیا۔ پھر دار العلوم دیوبند سے تعلیمی سلسلے کو پورا کر کے سند فراغت حاصل کی اور مدرسہ احیاء العلوم (مبارک پور) سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم کے تعمیری کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا پھر اسی میں فارسی کے استاذ مقرر ہوئے، مولانا نعمت اللہ صاحب عربی اور اردو زبان کے بہترین خطاط تھے اور ہندی وانگریزی پر بھی خاصا عبور تھا۔ طلباء ان سے بڑے شوق سے خوشخطی سیکھتے

تھے۔ لہٰذا قاضی صاحب نے بھی خوشخطی کا فن انھیں سے سیکھا۔ قاضی صاحب یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ ''مبارک پور میں یہ فن مولانا نعمت اللہ پر ہی ختم ہو گیا''۔[۴۰]

مولانا نعمت اللہ صاحب بڑے نیک دل انسان تھے۔ اپنے شاگردوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ ایک قابل استاد تھے اور طلبہ کی ذہنی تربیت کا انھیں اچھا سلیقہ تھا، نیز معاملہ فہمی اور اصابتِ رائے کے بھی مالک تھے، ان کی درس گاہ کے سیکڑوں طلباء عالم و فاضل بنے، آخر کمزوری اور ضعیفی کی وجہ سے بیمار رہنے لگے اور اسی کمزوری کی وجہ سے انھیں تدریسی سلسلے میں بھی پریشانیاں ہوئیں، چنانچہ حالات گردشِ زمانہ کی نذر ہو گئے اور انھیں مدرسی سے ہٹا دیا گیا اس پر افسوس کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ''پوری زندگی مدرسے کی خدمت کا انجام بہت تکلیف دہ رہا''۔[۴۱]

آخر کار ۱۳۶۲ھ یعنی ۱۹۴۳ء میں مدرسہ کے یہ معمار دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مولانا شکر اللہ صاحب

یہ بھی قاضی صاحب کے استاذ اور محسن و مربّی ہیں۔ انھوں نے قاضی صاحب کی دینی، ملّی، علمی، ذہنی و فکری نشو و نما میں اہم رول ادا کیا۔ مولانا شکر اللہ کے والد کو پا گنج کے رہنے والے تھے، مگر بعد میں مبارک پور آ کر رہنے لگے۔ مولانا شکر اللہ صاحب کی پیدائش مبارک پور میں چودھویں صدی کی ابتداء یعنی ۱۳۱۴ھ میں ہوئی۔[۴۲] انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی، پھر مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا، وہاں محمود معروفی صاحب سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ مطالعے کے شوق اور قوتِ حافظہ کی وجہ سے منطق کی مشہور کتاب ''تہذیب التہذیب'' زبانی یاد کر لی۔ ان دنوں مولانا شکر اللہ صاحب کے حالات بھی زیر و زبر تھے۔ اس لیے ان کے گھر والوں کا خیال تھا کہ یہ تعلیم چھوڑ کر کام پر لگ جائیں۔ مولانا اپنے گھر والوں کے اس خیال کی وجہ سے بغیر اطلاع کیے الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں مصباح العلوم میں محمد شریف مصطفےٰ آبادی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ انھیں ایام میں مولانا حکیم الٰہی بخش سے ملاقات ہو گئی (مولانا حکیم الٰہی بخش مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم تھے) انھوں نے گھر چلنے کے لیے اصرار کیا تو بڑی مشکل سے اس شرط پر راضی ہوئے کہ گھر پر انھیں تعلیم سے روکا نہیں جائے گا۔ چنانچہ گھر والوں کی اجازت کے بعد یہ لاہر پور ضلع سیتا پور کے مدرسہ چلے گئے اور وہاں پر معقولات و منقولات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فن تجوید اور قرأت

کی تعلیم بھی حاصل کی۔ حدیث کا درس مولانا رشید احمد گنگوہی سے لیا۔ پھر علی گڑھ تشریف لائے اور یہاں کے نامور عالم ماجد علی مانوی جونپوری سے کسب علم کیا۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، مولانا حافظ احمد صاحب، مولانا محمد انور شاہ کشمیری صاحب اور مولانا حسین احمد مدنی صاحب سے کسب علم کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جس پر مدرسے سے ایک گھڑی بطور انعام ملی مگر افسوس کہ وہ گھڑی ان تک نہیں پہنچ سکی۔ ۴۳

مولانا شکر اللہ صاحب نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد مدرسہ احیاء العلوم (مبارک پور) میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی، تعلیمی اور سیاسی میدان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولانا کے تعمیری کاموں میں مدرسہ احیاء العلوم کی عمارت، جامع مسجد اور عیدگاہ قابل ذکر ہیں جو قصبۂ مبارک پور کی تعمیری یادگار ہیں۔ مولانا شکر اللہ صاحب بدعات وخرافات کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے اس معاملہ میں بحث ومناظرہ بھی کیا ہے اور بہترین مقرر ہونے کی وجہ سے کئی کئی گھنٹے تقریریں بھی کیں ان کی علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی، اس لیے ہر فن کی کتابیں بلا جھجک پڑھایا کرتے تھے''۔

مولانا کو افہام وتفہیم میں بھی خداداد ملکہ حاصل تھا، لہٰذا عمر کے آخری حصہ میں مصروفیات کی زیادتی کے باعث منطق وفلسفہ کی کتابیں بغیر مطالعہ کے پڑھاتے تھے۔ خاص بات یہ کہ وہ کتاب نہیں کتابوں کے فن پڑھانے کے قائل تھے۔ اپنے طلباء سے محبت کرتے تھے انھیں زندگی کے ہر میدان میں انہیں کامیاب دیکھنے کے متمنی تھے ان کے شاگردوں میں قاضی اطہر مبارک پوری سب سے آخری شاگرد تھے۔

قاضی صاحب کے علاوہ مولانا عبدالباری اعظمی، مولانا شمس الدین، مولانا بشیر احمد بھی مولانا شکر اللہ صاحب کے فیوض وبرکات سے مستفید ہوئے، جب اللہ تعالیٰ نے انھیں خوش حالی بخشی تو انھوں نے حج بیت اللہ بھی ادا کیا اور سفر حج کے دوران جہاز میں برطانوی حکومت کے خلاف تقریر کی جس کی تحقیقات بعد تک ہوتی رہیں۔ ۴۴

ایک بار بدیسی مال کی مخالفت کے سبب ۱۹ر جون ۱۹۲۳ء میں گرفتار ہوئے اور چھ ماہ تک قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں، جس کی وجہ سے ان کی صحت کافی متاثر ہوئی، مگر پھر بھی مدرسہ کے مشاغل اور جماعت کے دوسرے کاموں میں دن رات انتھک محنت کی،

اس وجہ سے کافی کمزور ہو گئے اور دق جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر ۵ ربیع الاول بروز دو شنبہ ۱۳۶۱ھ میں بوقت چاشت داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی دن آبائی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

شکر اللہ صاحب کے جنازے میں کثرت سے لوگ شامل ہوئے ان کے انتقال کا دن مبارک پور میں یوم غم اور جنازہ مشہور تھا۔ مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارک پوری کے بعد یہ دوسرا جنازہ تھا جس میں لوگوں کی کثیر تعداد تھی۔[۵۵]

مولانا سید محمد میاں دیوبندی

سید محمد میاں سے قاضی صاحب نے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ محمد میاں نے ہی قاضی صاحب کی قدم قدم پر رہنمائی کی اور وہی ان کے اولین محسن و مربی تھے۔ ان کا اصل نام مظفر میاں ہے ۱۹۰۳ء میں بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا اور ضلع مظفر نگر کے میاں جی سے قرآن عزیز کا علم حاصل کیا۔ ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے آرہ شاہ آباد (بہار) میں مدرس ہوئے۔ اس کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں عرصہ دراز تک درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کے فرائض انجام دیے۔[۵۶]

اس کے علاوہ جمعیۃ العلماء ہند کی نظامت بھی کی۔ اور ایک سال تک ناظم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ یہ جمعیۃ العلماء کے مخلص کارگذار لیڈروں میں تھے اس لیے انھیں برطانوی دور میں کئی مرتبہ قید و بند سے بھی گذرنا پڑا۔[۵۷]

مولانا سید محمد میاں تصانیف کثیرہ کے مالک بھی ہیں۔ ان کی چند تصانیف کافی مقبول و معروف ہوئیں۔ چند کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی (۲) علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے
(۳) سیرت محمد رسول اللہؐ (۴) تاریخ اسلام کا عہد زریں
(۵) پانی پت اور بزرگان پانی پت (۶) تحریک شیخ الہند
(۷) مشکوٰۃ الآثار

مولانا نے یوں تو احادیث پر کافی کام کیا لیکن مشکوٰۃ الآثار ان کے احادیثی کارناموں میں کافی مشہور ہوئی۔ ان کی یہ تصنیف دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں بھی شامل

ہے اور دینی تعلیم کا رسالہ انھیں کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے، جمعیۃ العلماء اور اس کے ریکارڈ، نیز ہندوستان کے آخری عہد کی اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نگاہ تھی۔

قاضی صاحب اپنے استاذ سید محمد میاں کے بارے میں اپنے تاثرات ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

> ''مولانا اپنے معاصرین میں کئی باتوں میں ممتاز تھے۔ زہد وتقویٰ، استغناء و بے نیازی، عزت نفس وخودداری کے ساتھ پوری زندگی تدریس وتعلیم، تصنیف وتالیف، علمی و دینی خدمات اور ملی وقومی کاموں میں بسر کی۔ مولانا مرحوم محدث، فقیہ، مفتی اور مصنف سب کچھ تھے۔ ان کے مختلف الجہات علمی و دینی کارنامے خصوصاً تصنیفی و تالیفی خدمات ایک اکیڈمی کی کارکردگی کے برابر ہیں۔''[۴۸]

یہی وجہ ہے کہ دیوبند کی علمی وسیاسی اور دینی وتبلیغی خدمات پر ان کی تحریریں بڑی مستند ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے مصنفین بھی ان کے حوالے دیتے ہیں۔[۴۹] الغرض یہ کہ مولانا سید محمد میاں سادگی، خلوت نشینی، زہد وتقویٰ اور علم وفضل، ریاضت وعبادت میں بزرگانِ دین کا عملی نمونہ تھے۔ زندگی کے آخری دور میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور ادارہ مباحث کے فقیہ اور اس کے معتمد رہے اور ۱۳۷۰ھ سے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مولانا پوری زندگی خدمتِ خلق میں گذار کر ۱۹۷۵ء کو ۷۴ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا سید فخر الدین احمد صاحب

مولانا کا اصل وطن ہاپوڑ ہے، لیکن ان کے آباء واجداد عہدِ شاہجہاں میں ہرات سے دہلی منتقل ہو گئے تھے، ان کی ولادت ۱۸۸۹ء میں اجمیر شریف میں ہوئی، کیونکہ ان کے دادا عبد الکریم محکمۂ پولیس میں بطور ملازم تھے (تھانیدار) چنانچہ ان کا قیام بھی وہیں تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور فارسی کا علم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کیا۔ عربی، صرف، نحو وغیرہ کا علم مولانا خالد صاحب سے سیکھا۔ مزید تعلیم کے لیے گلاؤٹھی کے مدرسہ ''منبع العلوم'' تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا ماجد صاحب سے مختلف کتابیں پڑھیں پھر انہیں کے ساتھ دہلی چلے آئے اور وہاں معقولات کا علم حاصل کیا۔ ۱۹۰۸ء میں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

۱۹۱۰ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے تو دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ ۱۹۱۱ء میں مدرسہ شاہی مراد آباد چلے گئے۔ وہاں ۴۸ سال قیام کیا۔ اس طویل مدّت میں دور دراز کے طلباء نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ (انہیں طلباء میں سے قاضی اطہر مبارک پوریؒ بھی تھے) ۱۹۵۷ء میں مولانا مدنی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث رہے۔

مولانا تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی سیاست سے بھی گہرا ربط رکھتے تھے جس کے نتیجے میں گرفتار بھی ہوئے دو مرتبہ جمعیۃ العلماء ہند کے نائب صدر رہے۔ زندگی کے آخری ایام تک اس فرض کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ بیماری کی وجہ سے کمزور ہو گئے تو آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے مراد آباد آئے مگر دن بہ دن صحت خراب ہوتی چلی گئی آخر کار پانچ اپریل ۱۹۷۲ء کو علم وفضل کا یہ آفتاب سرزمینِ مراد آباد میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔۵۰

درس وتدریس

قاضی صاحب نے تعلیم وتعلم کی رسمی فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف مدرسوں واسکولوں میں تدریسی فریضہ انجام دیا۔ خود اپنے مادر علمی احیاء العلوم مبارک پور میں بھی پانچ سال تک بحیثیت مدرس رہے۔ مگر تدریس کا یہ دوران کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا۔ وہ اس دوران معاشی اور خانگی اعتبار سے کافی پریشان رہے۔ احیاء العلوم کے تدریسی دور کو ہی انھوں نے ”صبر ایوب اور گریہ یعقوب“ سے تعبیر کیا ہے۔

قاضی صاحب نے مدرسہ احیاء العلوم میں ایک سال تک عارضی مدرسی کی لیکن پھر اس کے بعد مستقل مدرس ہو گئے۔ آپ کی تنخواہ میں ۳ روپیے کا اضافہ ہوا جو مدرسے کے بقیہ معلمین پر بہت گراں گذرا اور انھوں نے مولانا پر ہتک آمیز جملوں کا استعمال شروع کر دیا جس سے تنگ آ کر قاضی صاحب نے مدرسہ سے استعفٰی دے دیا۔ استفعی کی عبارت اس طرح تھی:

> ”مدرّسی اور معلّمی کے شریف دامن کو جب ”جہالت کے شرارے“ جلا دینا چاہتے ہوں تو ایسی حالت میں علٰیحدگی اختیار کر لینا چاہیے۔ ویسے مدرسہ اپنا ہے، آئندہ حسبِ قدرت خدمت سے دریغ نہیں ہوگا۔“۵۱

۱۹۴۸ء میں قاضی صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے اور پوری مستعدی و دیانت داری سے وہاں کے طلباء کو دینی و علمی درس دیا، لیکن ڈابھیل کی فضا بھی انھیں راس نہیں آئی۔ کیوں کہ ”وہاں کا نظام تعلیم صرف خطابت وفتویٰ تک ہی محدود تھا۔

اس مدرسہ میں باہر ممالک جانے والے طلباء فتویٰ نویسی وغیرہ کی غرض سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک معیاری و تحقیقی تعلیم کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ ان طلباء کے نزدیک وہ اساتذہ اچھے تھے جو لمبی چوڑی تقریریں کیا کرتے تھے"۔ ۵۲

لہٰذا ڈابھیل کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے مطابق ان اساتذہ کو ہی مدرس قرار دیا جاتا جنھیں طلباء پسند کرتے تھے۔ بقیہ اساتذہ سال کے آخر میں ہی نکال دیے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک سال کے بعد قاضی صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ جس کو قاضی صاحب نے یوں منظوم کیا۔

خلوص سکنۂ گجرات تاجرانہ ہے
یہاں کے لوگ عموماً وفا شعار نہیں ۵۳

اس کے علاوہ قاضی صاحب نے انجمن ہائی اسکول ممبئ میں بھی دس سال تک اخلاقیات و دینیات کا درس دیا، اس وقت مولانا کی آمدنی تین سو پچاس روپیہ تھی، جو اس وقت کے لحاظ سے بڑی رقم تھی۔ اس کے بارے میں مولانا نے خود فرمایا ہے کہ"یہ زمانہ میری آمدنی کے لحاظ سے خوشحالی کا زمانہ ہے۔ یعنی ۱۹۶۰ء کا دوران کے لیے بہترین دور تھا۔ وہ بہت سی پریشانیوں سے نجات پا چکے تھے۔ خدا نے فراخی بخشی تو انھوں نے کئی بار حج ادا کیا اور قصبہ کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہونے لگے۔

صحافت

قاضی صاحب نے اپنی زندگی کے پچاس ساٹھ سال صحافت میں گذارے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ امرتسر گئے اور وہاں مرکز تنظیم اہل سنت و جماعت سے وابستہ ہوئے اور تیس روپیہ کی تنخواہ پر کام کرنا شروع کر دیا، لیکن پھر کچھ ہی دنوں بعد وہاں سے واپس آ گئے۔ اس مختصر قیام کے بعد لاہور تشریف لائے اور اخبار"زمزم" سے منسلک ہوئے اور اس کے کالموں کو مزین کرنا شروع کیا۔

اخبار"زمزم" میں مولانا کے دو سیاسی مضامین اور ایک مختصر سا دینی و اخلاقی مضمون ہوتا تھا۔ جب قاضی صاحب لاہور پہنچے تو کچھ ہی دنوں کے بعد تقسیم ملک کا مسئلہ شروع ہو گیا، ہر طرح فتنہ و فساد برپا تھا اس لیے موصوف اپنے وطن چلے آئے، کچھ دنوں تک یوں ہی خالی رہے، پھر مولانا محفوظ الرحمٰن (جو یوپی کے پہلی کانگریس حکومت کے

پالیمنٹری سکریٹری تھے) کے ساتھ بہرائچ گئے اور وہاں ہفتہ وار اخبار ''الانصار'' جاری کیا، مگر چند مہینے بعد حکومت کی پابندی کی وجہ سے وہ اخبار بند ہوگیا۔ جس نے قاضی صاحب کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کردیا کیوں کہ ان کے پاس کوئی ایسا کام نہیں تھا جس سے روزی روٹی اور بچوں کی پرورش کا انتظام ہوسکے۔

چنانچہ انھیں پریشانیوں کے ساتھ مولانا ممبئی پہنچے وہاں بھی صحافت سے ہی منسلک رہے اور ممبئی کے مشہور ومعروف اخبار جمہوریت میں بحیثیت نائب ایڈیٹر رہے۔ اس روزنامے میں وہ افکار ومطالعات کے عنوان سے دینی، علمی اور تاریخی وسیاسی مضامین لکھتے اور قرآنی جواہر پارے کے عنوان سے قرآن کی ایک آیت کی تشریح کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے اخبار جمہوریت کافی مشہور ہوا۔ لیکن کم ہی وقفے کے بعد حامدالانصاری غازی صاحب سے نااتفاقی کی بناء پر ''جمہوریت'' اخبار کو بھی خیرآباد کہنا پڑا۔ اس کے بعد روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی سے وابستہ ہوئے۔ اور اسی روزنامے میں قاضی صاحب نے چالیس سال کام کیا۔

اس میں جواہرالقرآن کے عنوان سے ایک آیت کی تشریح ہوتی تھی اور احوال و معارف کے عنوان سے تاریخی، دینی، علمی، سیاسی اور حالاتِ حاضرہ پر مختلف مضامین ہوا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے انھیں دونوں عنوان کی وجہ سے ''انقلاب''، ممبئی کا مشہور ترین اخبار بن گیا اور جمہوریت کی اہمیت کم ہوگئی۔ ''انقلاب'' سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا ماہنامہ ''البلاغ''، ممبئی کی ادارت بھی سنبھالتے رہے اور ۲۶ سال تک اس رسالہ کے مدیر رہے۔ یعنی ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کا تقریباً پورا دور صحافت میں گذرا لیکن اس کے باوجود بھی تصنیفی خدمت انجام دیتے رہے۔

مضمون نگاری

عہدِ طفولیت سے لکھنے پڑھنے کا شوق مضمون نگاری کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ چنانچہ مولانا نے زمانۂ طالب علمی سے ہی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کیے، پھر شوق جنون مضمون نگاری کے مرحلے میں داخل ہوا تو کثیرالتصانیف کی شکل میں ظاہر ہوا۔

آپ اپنی مضمون نویسی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''مضمون نویسی کے سلسلے میں صرف میرا ذوق میرا رہنما ثابت ہوا اور خوداعتمادی نے ہمت افزائی کی، معلومات کی

فراہمی، ان کی ترتیب اور اسلوب نگارش وغیرہ میں کسی کی رہنمائی حاصل نہ ہو سکی، اس لیے ایک مضمون کئی کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا''۔ ۵۴

قاضی صاحب نے یہ بات لکھ کر یہ ثابت تو کر دیا کہ ان کی مضمون نگاری بے منت استادی، مگر انھوں نے سید محمد میاں کی مدد کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لکھا ہے کہ ''مولانا سید محمد میاں (مرحوم) میرے اولین محسن و مربی ہیں۔ اگر ان کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ ''قائد'' مراد آباد میں میرے مضامین شائع نہ ہوتے تو میں تصنیف و تالیف کے لائق نہ ہوتا اور میری جولانی طبع نامساعد حالات کی نذر ہوگئی ہوتی۔ ۵۵

قاضی صاحب کی یہ تحریر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان کی مضمون نگاری بے منتِ استاد نہیں ہے۔ ان کی مضمون نگاری میں ان کے نانا احمد حسین صاحب اور ماموں محمد یحییٰ صاحب کی خدمات بھی شامل ہیں، ان دونوں بزرگوں نے ان کی قدم قدم پر رہنمائی کی ہے۔ مگر غالب گمان یہ ہے کہ مضمون نگاری اور تصنیفی و تالیفی کاموں میں قاضی صاحب کی محنت زیادہ درکار ہے، کیونکہ ان کی جہدِ مسلسل کی جھلک اس درج بالا عبارت میں پائی جاتی ہے۔

موصوف کی محنت شاقہ رنگ لائی تو انھوں نے کئی مضامین لکھے جو مختلف رسائل و جرائد میں چھپے۔ ان کا ایک مضمون ''واردھا کی خطرناک اسکیم'' اخبار ''الجمعیۃ'' میں دہلی سے شائع ہوا اور پھر رسالہ ''مومن'' بدایوں میں ۱۹۳۴ء میں دو مضمون ایک ''مساوات'' اور دوسرا ''رہا دین باقی نہ اسلام باقی'' کے عنوان سے شائع ہوا اور ایک مضمون ''بلا کشانِ اسلام'' کے نام سے گوجرانوالہ پنجاب سے نکلنے والے رسالہ ''العدل'' میں چھپا۔ اس کے بعد بھی بہت سے مضامین رسالہ ''قائد'' مراد آباد میں شائع ہوتے رہے۔

وعظ و خطابت

قاضی صاحب ایک محقق و مفکر، مورّخ و مصنف ہی نہیں تھے، بلکہ بہترین واعظ بھی تھے۔ ان کی تقاریر عوام و خواص پر بھرپور اثر انداز ہوتی تھیں۔ تقریری صلاحیت کی وجہ سے اساتذہ بہت خوش رہتے تھے اور بہترین مقرر ہونے کی وجہ سے ہم عصروں میں بھی سبقت لے جاتے اور اکثر و بیشتر اساتذہ سے پہلے بھی تقریریں کرتے، خواہ وہ دینی اجلاس ہو یا سیاسی اسٹیج، ہر جگہ تقریر کرنے میں پیش پیش رہتے۔ مولانا کی تقریریں سادہ مگر متاثر کرنے والی ہوتی

تھیں۔٥٦ ان کی ایک خاص عادت جلدی بولنے کی تھی، جس کی وجہ سے بعض الفاظ دب جاتے تھے۔ معنی واضح نہیں ہو پاتے تھے، مگر پھر بھی انداز بیان مؤثر ہوتا تھا۔

مطیع الرحمٰن صاحب اپنے مضمون ''قاضی صاحب بحیثیت مربی و معلم'' میں گواہی دیتے ہیں کہ ''قاضی صاحب جس موضوع پر لب کشا ہوتے تو ایسا لگتا کہ علم کا آبشار ہے، حافظہ بے پناہ تھا۔ اس کا اندازہ ان کی علمی و تاریخی گفتگو سے ہوتا ہے۔ موصوف ادیب و مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مقرر تھے، دو دو، ڈھائی ڈھائی گھنٹے تقریر کرتے لیکن تھکتے نہیں تھے۔٥٧

شاعری

قاضی صاحب شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے ان کا تخلص اطہر اسی ذوق سخن کی یادگار ہے۔ انھوں نے دور طالب علمی سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ اکثر و بیشتر کسی نہ کسی جلسے میں اپنی نظمیں پیش کرتے جس سے آپ کے اساتذہ خوش ہو کر خوب حوصلہ افزائی کرتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا کی شاعری نے انھیں آگے بڑھانے میں بہت مدد کی ہے۔ ان کی غزلیں، نظمیں مختلف اخبار و رسائل میں چھپنے لگیں جو مولانا کے لیے باعث فخر بات تھی اور اس چیز سے ان کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ ابھرنے لگا اور مولانا نے اعلیٰ پیمانے پر شاعری شروع کر دی۔

زیادہ تر اشعار ان کے دوست زبانی یاد کر لیا کرتے تھے اور محافل و مجالس میں بڑے مزے سے سناتے تھے۔ ان کے اشعار کا غلغلہ صرف اخبارات و رسائل تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ خود ان کا قصبہ مبارک پور بھی ان کے نغموں سے گونج اٹھتا تھا۔

قاضی صاحب کی ابتدائی نظموں میں جوش و جذبہ تو ضرور رہتا تھا، لیکن لطف بیان اور طرز اظہار میں جدّت و برجستگی نہیں پائی جاتی تھی، مگر عروج شاعری کے بعد طرز بیان کو بھی رفعت و بلندی ملی جس کے سلسلے میں اسیر ادروی صاحب جو قاضی صاحب کے دوستوں میں سے تھے، لکھتے ہیں کہ ''ابتداء میں ان کی نظموں اور غزلوں میں صرف پاکیزگی اور دلکشی ہوتی تھی، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر نکھار آنے لگا، ان کے شعروں میں رمزیت، معنویت، استعارات کا خوبصورت استعمال اور تخیل کی کارفرمائیاں نظر آنے لگیں۔ بلا مبالغہ یہ بات سچ ہے کہ مولانا موصوف کی شاعری ان کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوئیں، جس نے ان کی جہات علمی کو روشنی کے ساتھ ساتھ نور بصیرت سے بھی نوازا اور مولانا کے علمی

سفر کی راہوں میں مرحلہ شوق ثابت ہوئی۔ ۵۸

حج بیت اللہ

حج وزیارت کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب کے دل میں بھی یہ تمنا کروٹیں لیتی تھی۔ فرماتے ہیں کہ ''طالب علمی کے زمانہ میں سوچا کرتا تھا کہ مدرسی کی تنخواہ سے بچا بچا کر بہت دنوں کے بعد یہ دولت نصیب ہوسکتی ہے''۔ قاضی صاحب کی یہ خواہش اور اللہ کی رحمت سے یہ دولت احمد بھائی (اراکین انجمن خدام النبی) کے ذریعے پوری ہوئی۔ موصوف نے سب سے پہلا حج احمد بھائی کے تعاون سے ہی کیا، مگر جب اللہ نے فراخی وکشادگی عطا کی تو انھوں نے مزید چار حج اور کیے۔

قاضی صاحب نے سفرِ حج کے دوران وہاں کے علماء فضلاء اور کتب خانوں سے خوب استفادہ کیا۔ جب چوتھے حج کے لیے گئے تو ان کے بیٹے خالد کمال اس وقت (جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) میں زیر تعلیم تھے، انھوں نے اپنے والد صاحب کو بلاد اسلامیہ کی سیر کرائی اور مصر وشام قاہرہ اور اردن وغیرہ ممالک کی علمی شخصیتوں سے ملاقات بھی کرائی۔ وہاں کے اساتذہ وغیرہ سے مذاکرہ بھی ہوا۔ کتابوں کے تحفے تحائف بھی ملے، البتہ اردن میں بیت المقدس کی زیارت کرنی چاہی تو اسرائیل نے اس بات کی اجازت نہیں دی۔ ۵۹

قاضی صاحب نے پانچواں حج امیر الحجاج کی حیثیت سے کیا اور پھر مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا۔ مصر میں فراعنہ مصر کی لاشوں کو دیکھا، عمرو بن عاص، امام شافعی کے مزارات پر بھی حاضری دی۔ ۶۰

قاضی صاحب کے دوسرے سفرِ حج کو ''مکتوبات حجاز'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ جس میں سفر کے مصائب ومشکلات، آسانیاں وسہولتیں اور دوران سفر کی مصروفیات بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اور ان مکتوبات کو سلسلہ وار ۶ مکتوبوں میں پیش کیا ہے۔ ہر مکتوبہ میں سفر حج کی تفصیل موجود ہے اور مکہ مکرمہ میں حج کی ادائیگی، جدید حرم، عمرہ کی ادائیگی، مدینہ منورہ کے شب وروز جیسے ذیلی عناوین بھی شامل ہیں۔ ۶۱

اداروں کا قیام اور ان سے تعلق

قاضی اطہر مبارک پوری، مؤرخ ومحقق اور مصنف وادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دین وسیاست کی علمی وعملی زندگی سے بھی ربط رکھتے ہوئے دوسری تحریکوں سے

بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

اداروں کا قیام اوران سے تعلق بھی اسی تحریکی وتعمیری دلچسپی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آپ کا اداروں سے تعلق بہت گہرا تھا، اسی لیے بہت سے اداروں کی رکنیت بھی انھیں حاصل تھی۔

ضلع اعظم گڑھ اوراس سے متصل ومعروف علاقوں کے اداروں سے بھی انھیں انسیت تھی اور مدرسہ ''فرقانیہ'' (گونڈہ) سے بھی تعلقات وروابط تھے اور وہ ''انجمن تعمیرات ادب'' لاہور کے معتمد بھی تھے۔ ادارہ ''التراث العربی'' کویت کے مشیر علمی بھی تھے۔ نیز ''جمعیۃ العلماء'' مہارشٹر ممبئ کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن تاسیسی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ دارالمصنفین اعظم گرھ کے رفیق اعزازی، ماہنامہ برہان دہلی کے مدیر اعزازی دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اشرفیہ نیا بھوج پور (بہار) کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے ہیں۔[٦٢]

اس کے علاوہ مولانا کو قدرت کی عطا کردہ قومی، ملی، سیاسی، مذہبی، فلاحی، تحریکی اور علمی تڑپ نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ عوام کو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے دور کریں اور اسلامی اقدار وروایات کو زندہ کریں، چنانچہ مولانا کے انھیں جذبات کے تحت اداروں کا قیام میں عمل آیا۔

١٩٤٧ء میں دائرہ ملیہ مبارک پور کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کی غرض و غایت تصنیف وتالیف تھی، قاضی صاحب کی دو کتابیں ''افاداتِ حسن بصری'' اور ''تذکرہ علماءِ مبارک پور'' اسی ادارے سے شائع ہوئی۔[٦٣]

١٩٥١ء میں سب سے پہلے بھیونڈی کے صاحب حیثیت لوگوں کی مدد سے مدرسہ مفتاح العلوم قائم کیا۔ اس مدرسے میں ماسٹر حاجی محمد مبین اور حاجی عبدالغنی رحیم اللہ نے بھی کافی تعاون کیا۔ قاضی صاحب کے دوست مولوی محمد یٰسین صاحب اعظمی اس مدرسہ کے پہلے مدرس ہوئے۔ دھیرے دھیرے یہ مدرسہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتا گیا اور اس سے ہزاروں طلباء فیض یاب ہوئے۔ اب وہ مدرسہ (مفتاح العلوم) ترقی واستحکام کی منزلوں کو عبور کر کے دین کا مضبوط قلعہ بن چکا ہے۔[٦٤]

قاضی صاحب کا تعمیر کردہ یہ مدرسہ آج بھی تشنگان علوم کو سیراب کر رہا ہے۔ اور

اس سے فارغ ہونے والے طلباء، علماء وفضلا کی صف میں شامل ہو رہے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں کی بھی بنیاد پڑی۔ یہ ادارہ کئی ذی علم اور صاحب ثروت افراد کی سرپرستی میں قائم کیا گیا۔ اس کے قیام کا مقصد عربی کی نادر و نایاب کتابیں اور مخطوطات شائع کرنا تھا، یہ ذمہ داری مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث کبیر کو سونپی گئی، انھوں نے اس ذمہ داری کو بڑی ایمان داری سے نبھایا، اس ادارے سے سب سے پہلی کتاب ''انتقاء'' شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ عبداللہ ابن مبارک کی کتاب ''الزہد والرقائق'' کی اشاعت بھی یہیں سے ہوئی۔ کچھ دنوں تک قائم رہنے کے بعد یہ ادارہ علاقائی عصبیت کی وجہ سے بند ہو گیا اور قاضی صاحب نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ۶۵

۱۹۶۵ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ مبارک پور کے نام سے بھی ایک ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں دو میٹنگ بھی ہوئیں، ایک ''مئو'' میں دوسری ''ادری'' میں مگر یہ خواب بھی اپنی تعبیر نہیں پا سکا۔

۱۹۸۰ء میں جامعہ حجازیہ کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا گیا، (یہ مدرسہ مبارک پور میں قائم کیا گیا) اس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر عربی و فارسی کی تعلیم کا بھی سلسلہ جاری ہوا۔ لیکن حالات کی ناسازی کی وجہ سے کچھ دنوں تک یہ مدرسہ بند رہا، مگر ان کی اولاد اس کی ترقی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس مدرسے میں تعلیمی سلسلہ جاری ہے۔

مبارک پور میں بھی لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک اسکول کھولا، یہ اسکول (حاجی عبدالغنی اطلس والا مبارک پوری ثم بمبئی) کی مدد وتعاون سے کھولا گیا، کیونکہ اس وقت مبارک پور میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا، اس لیے حاجی عبدالغنی صاحب نے بھی اپنی مادر وطن کی گود میں اس ضرورت کو محسوس کیا، لہٰذا ۱۹۷۶ء میں انصار گرلس اسکول کے نام سے یہ فلاحی ادارہ قائم کیا گیا۔ اب وہ ادارہ ترقی کر کے انصار گرلس انٹر کالج کے نام سے شہرت پا چکا ہے اور اس میں تقریباً تیرہ سو لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ ۶۶

علالت اور وفات

آخری عمر میں قاضی صاحب بیماری کے باعث کمزور ہو گئے تھے اور موصوف کو ہمیشہ نزلہ رہا کرتا تھا، جس کی وجہ سے ناک میں بدگوشت ہو گیا تھا، اس لیے ناک کا آپریشن کرایا گیا۔ مگر ڈاکٹروں کو کینسر کا شک ہوا، کیونکہ وہ زخم اچھا نہیں ہو رہا تھا، علاج بدستور

جاری تھا مگر فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق قاضی صاحب کے جسم کا پورا حصہ کینسر سے متأثر ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے کمزوری بڑھتی جا رہی تھی، پیشاب میں بھی تکلیف ہوتی تھی، منھ کا ذائقہ بگڑ گیا تھا، کھانے کی اشتہا ختم ہو چکی تھی، تکلیف کی شدت سے بار بار بے ہوش ہو جاتے تھے، اچانک سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور پھر الٹی سانسیں چلنے لگیں، نیم غنودگی کی کیفیت طاری ہو گئی اسی حال میں ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء کو علم و عمل کا یہ روشن مینارہ اپنی روشنی سے گمنام و تاریک گوشوں کو منور کرتا ہوا اپنے رب حقیقی سے جاملا۔ قانونِ قدرت کے مطابق "کل من علیھا فان" کا اطلاق ہو کر رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔[67]

دوسرے روز ۱۵ر جولائی ۱۹۹۶ء کو تدفین عمل میں آئی، قرب وجوار کے علماء و فضلاء نے کثیر تعداد میں شرکت کی، مولانا ابوالقاسم نعمانی بنارسی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز جنازہ میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

عادات واخلاق

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب ایک بے لوث، شریف النفس اور پاک طینت شخص تھے، ان کی زندگی تکلفات سے بَری اور سادہ تھی۔ حتی کہ عادات و اطوار، رہنے سہنے، ملنے جلنے غرضیکہ کسی بھی انداز سے غرور و تمکنت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی اپنے ملنے والوں پر خواہ مخواہ اپنی عظمت و برتری کا سکہ جماتے۔ انھیں ظاہری نام و نمود اور جاہ طلبی سے بھی نفرت تھی، ہمیشہ چھوٹوں اور بڑوں سے یکساں برتاؤ کرتے۔

لیکن ایک فطری خاصیت یہ بھی تھی کہ اپنے بڑوں کا واجبی احترام تو ضرور کرتے مگر بے جا عقیدت سے گریز کرتے۔ غریب اور کم حیثیت کے لوگوں سے ملنے جلنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے بلکہ اس کے برعکس امراء و اغنیاء کے پاس جانا ان کی خوشامد کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا، اس کام میں اپنی اور اپنے علم دونوں کی توہین سمجھتے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب قاضی صاحب کے عادات و اخلاق کے تابناک پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ کسی تفریق و امتیاز کو پسند نہیں کرتے تھے، بڑوں کی طرح چھوٹوں سے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح ناخواندہ اور اصحاب جاہ و حشمت اور ذی

حیثیت لوگوں کی طرح غریب اور مفلوک الحال و کم حیثیت لوگوں سے
ملنے جلنے میں انھیں کوئی عار نہ تھا، حتیٰ کہ اپنے خردوں و نیاز مندوں
سے بھی بڑی گرم جوشی سے ملتے۔ ہمیشہ ان کی ہمت و حوصلہ افزائی
کرتے، ان کا دل بڑھاتے اور ان کی دلجوئی کرتے"۔ ۶۸

اور تذکرہ علماء اعظم گڑھ کے مصنف مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی جگدیش پوری صاحب اپنے تعزیتی مضمون میں مولانا کی اس خصوصیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ "کم و بیش پچیس سال تک قاضی صاحب کی صحبت نصیب رہی۔ ہر حال میں مرحوم کی شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی علمی عظمتوں کو نظر انداز کر کے مجھ جیسے چھوٹے کے ساتھ بہ تکلف نہیں بلکہ بتلطّف چھوٹے بن جاتے تھے۔ قاضی صاحب کی بے پناہ شفقتوں اور مخلصانہ ہمت افزائیوں نے مجھے قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔ ۶۹

موصوف کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے تکلف و تصنع سے گریز کرتے، ان کی طبیعت میں بڑی غیرت و خودداری تھی، اسی وجہ سے کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے جاہ و منصب سے مرعوب ہوتے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اہلِ علم کی قدر کرتے اور ان کی تعریف کرتے۔ اگر ہم صدق دلی سے ان کی عادات و اخلاق کا اعتراف کریں تو وہ عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں کی ایک زندہ تصویر تھے۔ ان کی سنجیدگی، تواضع، ملنساری، شیریں کلامی، نرم گفتاری نے انھیں مکارمِ اخلاق کا پیکر بنا دیا تھا۔

کثرتِ مطالعہ

مولانا قاضی صاحب کو بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا اور اسی شوق نے انھیں ایک عظیم مفکر و مصنف اور محقق بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ مولانا بچپن سے ہی درسی اور غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ معنی و مطالب پر بھی غور و خوض کرتے اور اخذ و اقتباس بھی۔ ۷۰

"قاضی صاحب کے مطالعے کا نہ تو کوئی وقت مقرر تھا اور نہ ہی جگہ، بلکہ
وہ ہر جگہ ہر وقت کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کھاتے، پیتے، اٹھتے،
بیٹھتے ہر صورت اور ہر حالت میں اپنے علمی سفر کو جاری رکھتے"۔ ۷۱

اگر یوں کہا جائے کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ کتابوں کی سیر کے لیے وقف تھا تو بے

جانہ ہوگا۔ حالانکہ اس زمانے میں گاؤں میں بجلی وغیرہ کا معقول انتظام نہیں تھا، مگر پھر بھی مولانا لالٹین کی روشنی میں رات بھر پڑھا کرتے تھے۔ جب کہ ان کی والدہ صاحبہ اس وجہ سے بہت متفکر رہا کرتی تھیں کہ کہیں رات بھر پڑھنے سے بینائی کمزور نہ ہو جائے، اس لیے ان کو بچپن سے ہی چشم آشوب کی شکایت تھی اور ان کے اساتذہ کرام بھی زیادہ پڑھنے کو منع کیا کرتے تھے اور جب قاضی صاحب نہیں مانتے تو از راہ محبت کہتے کہ زیادہ پڑھو گے تو اندھے ہو جاؤ گے۔ مولانا مسکرا کر ادب سے جواب دیتے کہ اگر ایسا ہو گیا یعنی اندھا ہو گیا تو یہ کام خود بخود بند ہو جائے گا۔ خود اپنی ضعفِ بصر کے بارے میں خبر دیتے ہیں کہ ''مطالعے کی کثرت سے میری آنکھوں میں سوزش پیدا ہو جاتی تھی اور بسا اوقات دانے بھی نکل جاتے تھے اور کبھی سردرد و چکر کی شکایت بھی ہو جاتی'' مگر اس کمزوری اور پریشانی کے باوجود بھی مولانا اپنی عادت سے باز نہیں آتے، کیونکہ بچپن سے ہی ان کا عزم مصمم ثریا پہ کمندیں ڈالنے کا تھا اور ان کو اس ارادے میں بھرپور کامیابی بھی ملی۔

مطالعے کی کثرت سے بڑی مدد ملی اور عربی کے مشکل مفہوم سمجھنے میں آسانی پیدا ہوئی۔ مطالعے کا یہ عمل ان کی صلاحیتوں کے نکھار میں بہترین معاون ثابت ہوا، اس لیے انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی اپنے ہم عصر طلباء کی تدریسی خدمت کی اور اس خدمت کی بدولت انھیں خود اعتمادی، علمی استعداد، مضمون نگاری، تصنیفی ذوق، شعر و شاعری، بحث و مناظرہ، تقریر خطابت میں شہرت کی حد تک کامیابی ملی۔ کثرت مطالعہ کے سلسلے میں قاضی صاحب کے دوست اسیر ادروی صاحب اپنے مضمون ''حدیثِ یار'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''قاضی صاحب طالب علمی کے دور سے ہی اردو اور عربی کتابوں میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے، جب کہ ہم لوگ اپنی عمر کے طبعی تقاضوں کے زیر اثر اردو ادب، شعر و شاعری، ناولوں اور ادبی رسالوں کی گلریز وادیوں کی سیر کو ہی حاصل زندگی سمجھتے تھے، مگر قاضی صاحب اس عمر میں تذکرۃ الحفاظ، فتوح البلدان، المسالک الممالک، تقویم البلدان، کتاب الذخائر والتحف جیسی خشک کتابوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے''۔ ۲۷

بعض اوقات ان کے ہم عصر طلباء ان پر جارحانہ تنقیدیں کرتے تھے مگر اس کا کوئی

اثر نہ ہوتا تھا، ظفر احمد صدیقی صاحب اپنے مضمون ''قاضی صاحب بحیثیت مؤرخ ومصنف'' میں یہ شہادت پیش کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کو ادب، لغت کے علاوہ تاریخ، طبقات اور سیر وتراجم کی کتابوں کے مطالعے کا ذوق اور ان سے شغف زمانہ طالب علمی سے ہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس مطالعے کی بدولت عربی میں ایک کتاب ''مرآۃ العلم'' کے نام سے مرتب کی جس میں علماء سلف اور مختلف ائمہ علم وفن کے واقعات جمع کیے''۔[۳۷]

آپ کے مطالعے کی چند کتابوں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جن سے ان کے شوق مطالعہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبدالبر

(۲) وفیات الاعیان لابن خلکان

(۳) سیرت ابن ہشام

(۴) تہذیب التہذیب لابن حجر

(۵) طبقات الامم لابن صاعد الاندلسی

(۶) فتوح البلدان لابی الحسن البلاذری

(۷) زادالمعاد فی ہدی خیر العباد لابن القیم

(۸) کتاب الخروج للقاضی ابی یوسف

(۹) دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانی

(۱۰) الفہرست لابن ندیم۔ وغیرہ۔

کتابوں کی خریداری کی مشکلات اور ان کا سدِ باب

معیشت کی فراوانی وفراخی نہ ہونے کے سبب قاضی صاحب کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر پھر بھی ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آئی اس معاملے میں ان کی ہمت و خودداری وخوداعتمادی ہی بہترین معاون ثابت ہوئی۔ یوں تو وہ اپنی ہر خواہش کو قابو میں رکھ کر اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھے ان کی منزل علوم کا حصول تھی۔ جس کے لیے انہیں کتابوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ کتابوں کے حصول میں انھوں نے ہر طرح کی حکمتِ عملی سے کام لیا اور کبھی بھی تنگی وعسرت کے باوجود احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے ذوق کے مطابق انھوں نے بہت سی کتابیں خریدلیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) مختار الصحاح رازیؒ ۱۳۵۳ھ
(۲) ادب الکاتب ابن قتیبہ
(۳) کتاب الامنہ ادفی اللغۃ ابن بشار انباریؒ ۱۳۵۳ھ
(۴) کتاب المعارف ابن قتیبہ ۱۳۵۴ھ
(۵) دیوانِ نابغہ ذبیانی
(۶) دیوانِ زہیر بن ابی سلمیٰ
(۷) مقدمہ ابن خلدون ۔ یہ کتاب قاضی صاحب نے اس پیسے سے خریدی تھی جوان کے استاد محترم مولانا محمد یٰسین صاحب نے امتحان میں اوّل آنے پر ایک روپیہ انعام دیا تھا۔
(۸) دلائل الاعجاز عبد القاہر جرجانی
(۹) الاخبار الطول ابوحنیفہ دینوری
(۱۰) طبقات الامم
(۱۱) تفسیر ابن کثیر چار جلدوں میں وغیرہ۔

قاضی صاحب کی خریدی ہوئی بہت سی کتابیں ہیں مگر یہاں صرف چند کتابوں کا ہی تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ تمام کتابیں بڑی محنت اور تنگ دستی کی حالت میں خریدیں اور انھیں بہت سنبھال کر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ان کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ بھی مولانا کے کارناموں میں سے بہترین کارنامہ ہے۔

(۱) کتاب النکت فی اعجاز القرآن (ابوالحسن علی بن عیسیٰ زمانی متوفی ۱۴۳۸ھ
(۲) کتاب الالفاظ المتر ادفہ (ابوالحسن علی بن عیسیٰ زمانی)
(۳) دیوان امراؤالقیس
(۴) مختصر الجرجانی فی اصول الحدیث
(۵) دیوانِ فرزدق۔ (یہ بیروت کے مطبوعہ دیوان سے نقل کیا گیا ہے)
(۶) انباء الاذکیاء فی حیات الانبیاء، (امام سیوطی کے مطبوعہ رسالہ سے نقل کیا ہے)
(۷) ''کتاب اندرات'' اصمعی کی مختصری کتاب ہے۔
(۸) عروض وقوافی۔ بیروت میں چھپا ہوا ایک رسالہ

(۹) الاستیعاب سے سیرتِ نبوی کا پورا حصہ کتابی شکل میں نقل کیا ہے۔
(۱۰) فقہ اللغۃ کی پہلی فصل
(۱۱) منتخب الشعار والغاز
(۱۲) علماء اسلام کے قصص واحوال وغیرہ وغیرہ۔

قاضی صاحب کی خریدی ہوئی اور لکھی ہوئی کتابوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابوں کے کتنے شوقین تھے، ان کتابوں کو اپنے دوستوں سے بھی بچا کر رکھتے کیونکہ یہ ان کی محنت ومشقت کا سرمایہ تھیں۔

قوتِ حافظہ

-اللہ رب العزت نے قاضی صاحب کا حافظہ اتنا قوی کر دیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی، یا پڑھی ہوئی چیز یاد ہو جاتی تھی، یہی وجہ ہے عربی اور فارسی کے بکثرت اشعار انہیں زبانی یاد تھے، جن کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مولانا نظام الدین عرف اسیر ادروی صاحب موصوف کے قوت حفظ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''ان کا عربی ادب کا ذوق بڑا پختہ تھا وہ اپنے دوستوں کی محفل میں اکثر وبیشتر سبعہ معلقہ، دیوان حماسہ اور مختلف جاہلی شعراء کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ جو ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔[۳۷]

قاضی صاحب اپنی خودنوشت سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں لکھتے ہیں کہ: ''بچپن میں میرا حافظہ بہت قوی تھا۔ اسی مناسبت سے مجھے چھ مہینے کی عمر اور سال بھر کی عمر کے واقعات یاد ہیں''۔[۳۸]

عزم واستقلال

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ہمت وحوصلہ اور عزم وثبات کا پیکر مجسم تھے۔ ان کی شخصیت سیرت وکردار کی نمایاں خصوصیات محنت ومشقت کی جدوجہد تھی۔ ان کی پوری زندگی صبر واستقلال اور ثابت قدمی کی ضامن رہی۔ علاوہ ازیں ایک ہی موضوع پر کئی کتابیں خود ان کے استقلال کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

ظفر احمد صدیقی نے قاضی صاحب کے استقلال کی خوبیوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''عام طور پر طبیعتیں کچھ دنوں تک کسی خاص موضوع پر کام کرنے سے اچاٹ ہو جاتی ہیں خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ کام

کسی درجہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے لیکن قاضی صاحب میں ایسی استقامت طبع تھی کہ ایک موضوع پر کام کرتے ہوئے وہ اکتاتے نہیں تھے۔ بلکہ پلٹ پلٹ کر اس کی طرف رجوع کرتے"۔۵۷

مولانا ظفر احمد صدیقی صاحب کی درج بالا تحریر سے قاضی صاحب کی مستقل مزاجی، ہمّت وحوصلہ کی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔

قناعت خودداری

اگرچہ قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کی دینی حمیت، غیرت اسلامی، عزت نفس اور دنیا بے زاری ان کی داستان حیات کے روشن ابواب ہیں تو اسی باب کا ایک حصّہ قناعت وخودداری بھی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ دین داری ودیانت داری کو ترجیح دیتے ہوئے دنیاوی ومعاشی لذّت کوشی کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اس لیے انھیں کبھی بھی اپنی خودداری کا سودا نہیں کرنا پڑا۔

ان کی طالب علمی کا یہ واقعہ ان کی قناعت وخودداری کا غماز ہے۔ قاضی صاحب مراد آباد تشریف لے گئے تو ابتداء میں انھیں ایک گھر سے کھانا لانا پڑتا تھا۔ جوان کی نازک طبیعت پر بڑا گراں گذرتا، بڑی مشکل سے ایک دو ہفتہ یہ کام انھوں نے کیا۔ پھر مدرسہ (قاسمیہ شاہی مراد آباد) سے انھیں ڈھائی روپیہ مہینے کا وظیفہ ملنے لگا اور انھوں نے ایک معمولی ہوٹل میں کھانا شروع کر کے دوسرے گھر سے کھانا لانے کی مشکل سے نجات حاصل کر لی۔

قاضی صاحب نے تنگی وافلاس کے باوجود قناعت وخودداری کے قیمتی گوہر کو بچائے رکھا، یہی وجہ ہے کہ چالیس سال تک ممبئی میں رہنے کے باوجود بھی اس کی رنگین فضا کا کوئی اثر نہیں لیا یہ قناعت وخودشناسی کا جذبہ تھا جس سے انھوں نے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔

میرے خیال میں اگر انسان قناعت پسند ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے اور محنت کرتا ہے تو دنیا کی کوئی بھی چیز اس کے لیے کافی ہے اور انسان ہر جگہ ہر حال میں خوش و خرم اور دولت مند ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو خزانہ قارون اور دولتِ فرعون کی فراوانی کے باوجود بھی مفلس وبے مایہ ہے۔

قاضی صاحب کی قناعت، وخودداری طالب علموں اور عوام کے لیے آگے بڑھنے کے لیے ایک سبق ہے۔

دنیا سے بے نیازی

قاضی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ علم سے مالا مال کیا تو دولتِ دنیا سے بے نیاز کر دیا۔ مولانا کبھی بھی کسی صاحب دولت وثروت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ امراء واغنیاء ان کو بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کرتے مگر قاضی صاحب انھیں ٹھکرا دیتے اور اپنے آپ کو ہمیشہ امراء واغنیاء کی چاپلوسی سے دور رکھتے۔ دولت مند تاجر اور اسی طرح رئیس و کبیر لوگ آ کر اپنی جبین نیاز خم کرتے مگر آپ ہمیشہ شان بے نیازی پر قائم رہے۔

اس بات کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ایک بار شاہ اردن ہندوستان تشریف لائے، عرب جوہری نے آپ کو بھی دعوت نامہ دیا، کیونکہ قاضی صاحب کو عرب ممالک سے آنے والے معزز مہمانوں کی ترجمانی کے لیے بلایا جاتا تھا اس لیے شاہ اردن کی تشریف آوری پر بھی آپ کو دعوت نامہ دیا گیا۔ اس دعوت نامہ میں اعلیٰ پیمانہ پر رقص وسرور کا پروگرام تھا، اس لیے آپ نے اس دعوت نامہ کو رد کر دیا۔ ۷۶

مولانا نے اپنی عزت ایمانی کے باعث اس پروگرام میں جانا پسند نہیں کیا۔ اس سلسلے میں قمر الزماں مبارک پوری صاحب اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''عروس البلاد ممبئی جسے دولت کا شہر کہا جاتا ہے اور جس کی آغوش میں سب کو روزی روٹی ملتی ہے۔ مولانا کی نظر میں وہ علم کش شہر ہے۔ اس شہر میں قاضی صاحب کی تصنیفی و علمی زندگی کا دور زرّیں گذرا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو دولت کمانے کے ہزاروں حیلے، بہانے بناتے مگر ان کے اندر جو دنیا بیزاری اور علم پروری واخلاص دینی تھا اس نے دولتِ دنیا کمانے کے تمام راستوں کو مسدود کر دیا تھا''۔ ۷۷

کفایت شعاری

مالی پریشانیوں اور تنگ دامانیوں نے مولانا کو کفایت شعار بنا دیا تھا، بچپن کی اس عادت نے ان کی زندگی پر بہت اچھا اثر ڈالا، انھوں نے اپنی انہی عادت کی وجہ سے پیسے بچا بچا کر بہت سی کتابیں خریدیں اور جن کتابوں کی فراہمی ممکن نہ ہوتی تو پوری کتاب کو بعینہٖ نقل کر لیتے اور انھوں نے جلد سازی کر کے بہت سی کتابیں خریدیں۔

کفایت شعاری کی بدولت ہی وہ دنیاوی لذّتوں اور مادّیت کے سحر سے مکمل آزاد

تھے، جس کو موصوف نے اپنی خودنوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ''طالب علمی کا پورا دور عسرت و تنگی میں گذرا، یہاں تک کہ کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے غرضیکہ ہر چیز میں سادگی تھی، اس وقت معاش و معیشت کی فراوانی نہیں تھی اس لیے عام طور سے لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے'' پھر مزید یہ بیان کیا ہے کہ ''کفایت شعاری، سادگی، خودشناسی اور کم آمیزی نے مجھے بہت فائدہ دیا اور اسی کی برکت سے ممبئی جیسے شہر میں رہ کر ذہن و مزاج کو اس شہر کی رنگینی سے بچائے رکھا اور اپنے معمولی سے کمرہ میں بیٹھ کر علمی و تصنیفی کام کیا''۔۷۸

مہمان نوازی

مولانا قاضی صاحب کی تواضع، ملنساری اور خاکساری نے انھیں مہمان نوازی کے گر بھی سکھائے، اس لیے وہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں اپنی توفیق و استطاعت سے بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی خاطر و مدارات میں کوئی کمی نہ ہونے دیتے۔ ان کا دستر خوان اہل علم اور صاحب قلم کے لیے ہمیشہ وسیع رہتا تھا اور ہر عام و خاص کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خاطر و مدارات کرتے۔

قاضی صاحب اہلِ علم کی بڑی قدر کرتے۔ ان کی پذیرائی میں کوئی کمی نہ ہونے دیتے، یہی وجہ ہے کہ دور دراز علاقوں سے آنے والے اہل علم بلا جھجک ان کے دروازے پر دستک دیتے۔ ضیاء الدین اصلاحی صاحب ان کی اس خوبی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

> ''ایک زمانے میں ان کا معمول ہو گیا تھا کہ سال میں کسی نہ کسی بہانے ہم نیاز مندوں کو وہ اپنے دولت کدہ پر ضرور بلاتے اور بڑی پر تکلف دعوت کرتے''۔۷۹

اس کے علاوہ قاضی صاحب نے بھی اپنے حالات زندگی لکھتے وقت صفحہ نمبر ۱۴۶ پر یہ لکھا ہے کہ ''میری اہلیہ (سائرہ خاتون) میرے علم کے بغیر پیسے بچا بچا کر میرے دوستوں کی پر تکلف دعوت کرتیں''۔

دوسرے مسالک کے علماء سے تعلق

قاضی اطہر مبارک پوری ایک عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے مسالک کے علماء سے بھی خاصا تعلق رکھتے تھے۔ ان کو ہر مسلک کے اہل علم کی محبت و رفاقت اور علمی مجالس سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے کبھی بھی گروہی عصبیت و جماعت بندی کو اہمیت نہیں دی

بلکہ ہمیشہ اس چیز کو ناپسند کیا، مولانا کی وسعت قلبی، بلند خیالی، فراخ دلی، اخلاصِ علمی نے انھیں کوہِ ہمالہ کی سی بلندی عطا کی۔

اسی وصفِ خاص کی وجہ سے دوسرے مسالک کے علماء نے ان سے بات چیت کرنے میں بھی کبھی وحشت و دہشت محسوس نہیں کی۔ قاضی صاحب خود بھی ان لوگوں سے نشاط علمی اور انشراح قلبی سے ملا کرتے تھے۔ یوں تو وہ خود جمعیۃ علماء ہند سے تعلق رکھتے تھے، مگر پھر بھی تمام مسالک کے علماء کی علمی و دینی خدمات کا صدق دلی سے اعتراف کرتے، ان کے فن صحافت کے استاد عثمان فارقلیط خود مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن استاد اور شاگرد میں کبھی جماعتی و گروہی عصبیت نہیں پائی گئی، دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام کرتے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی قاضی صاحب کے قدر دانوں میں سے تھے۔ انھوں نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ "آپ کا قلب اور قلم دونوں گروہی عصبیتوں سے پاک ہے" [۸۰] اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا ہر طبقۂ فکر کے علماء سے بھی ذہنی وابستگی رکھتے تھے اور ان کے اقتباسات وافادات سے بھی مستفید ہوتے، خود مبارک پور کے بوہرہ فرقہ کے ایک بڑے عالم ملا رحمت علی اسمٰعیل صاحب سے بڑے اچھے مراسم تھے، رحمت علی صاحب عربی کے زبردست شاعر ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے قاضی صاحب کو مشہور فلاسفی شاعر ابوالعلاء معری کا رسالہ "الغفران" پڑھنے کے لیے دیا جسے انھوں نے بڑی دلجمعی سے پڑھا، نیز ان سے علمی و دینی معلومات بھی حاصل کیں۔

بوہرہ فرقہ سے اچھے مراسم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قاضی صاحب ہر طرح کے لسانی، قومی اور مسلکی تعصبات سے بالاتر تھے، ان خوبیوں کا اعتراف ضیاء الدین اصلاحی صاحب ان لفظوں میں کرتے ہیں:

> "بڑے فراخ دل، کشادہ قلب اور وسیع المشرب تھے، ان کے دل میں ہر طبقہ و مسلک اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے یکساں گنجائش تھی، تعصب، تنگ نظری، تخریب اور فرقہ آرائی کی لعنتوں نے ان کے قلب کو داغ دار نہیں کیا، وہ طبقۂ فکر اور ہر حلقۂ خیال کے لوگوں کے ساتھ نشست و برخواست رکھتے، ان کے اصحاب و کمال کی قدر کرتے، ان کی عظمت و بلندی کا نقش اور شرافت و محبت کا جلوہ جہاں

بھی دکھائی دیتا اس کے سامنے بلا امتیاز و فرقہ قوم اپنی جبینِ نیاز خم کردیتے''۔[۸۱]

فقہی بصیرت

مولانا قاضی صاحب مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔ وہ ہر چھوٹی بڑی کتاب اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے اسی شوق مطالعہ کی نسبت انھوں نے علوم متداولہ کی تمام کتابیں پڑھ کر اپنے علم کو وسیع سے وسیع تر کرلیا تھا۔ یعنی انھوں نے کثرتِ مطالعہ سے ایسی صلاحیتیں پیدا کرلی تھیں کہ انھیں آگے کے علمی سفر کے لیے چراغ راہ کی زیادہ ضرورت نہیں تھی، اسی کے ساتھ ساتھ فقہی بصیرت میں بھی عبور حاصل کرچکے تھے وہ ائمہ اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے مسلک اوران کے اختلافات ومباحث سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی واقفیت کی بنا پر انھوں نے بہت سے مضامین ومقالے لکھے جوان کی فقہی بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ مقالے اور مضامین درج ذیل ہیں:

(۱) جنوری ۱۹۶۷ء میں ''الآ ثار''
(۲) جولائی ۱۹۵۴ء میں ''فقہ اہلِ سنت کی ترویج واشاعت''
(۳) ستمبر ۱۹۵۴ء میں امام سرخسی اور اصول سرخسی وغیرہ لکھی۔
(۴) جون ۱۹۷۲ء میں ''اسلامی شریعت اور حالات وزمانہ''
(۵) جون ۱۹۷۲ء میں ہی ''چند مسائل رمضان''
(۶) اکتوبر ۱۹۷۳ء میں فقہ اہل سنت کی ابتدائی تاریخ۔

اس کے علاوہ ایک کتاب ''ائمہ اربعہ'' بھی لکھی، اس میں چاروں اماموں کے معتبر اور مستند حالات اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ مقالہ ''فقہ اہل سنت کی ابتدائی تاریخ'' جب ماہنامہ البلاغ کے شمارہ نمبر ۲ میں جولائی ۱۹۵۴ء کو پہلی بار شائع ہوا تو انھیں بڑی کامیابی ملی اور ممبئی میں جمعیۃ العلماء کے دفتر میں تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں انھیں فتویٰ نویسی کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔[۸۲]

حلیہ اور لباس

قاضی صاحب کا قد درمیانہ، پیشانی چوڑی اور ناک لمبی تھی، جسم متوازن اور رنگ سانولا تھا۔ داڑھی گھنی تھی اور آنکھوں پر چشمہ لگاتے تھے۔ جس کا پاور بہت زیادہ تھا، ان کا

لباس سادہ لیکن صاف ستھرا ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔

قاضی صاحب زیادہ تر سفید گزی گاڑھے کا کرتہ پائجامہ پہنتے تھے اس پر کبھی صدری استعمال کرتے اور کبھی شیروانی زیب تن کرتے، ٹوپی ہمیشہ کشتی نما اور اچھے کپڑے کی ہوتی تھی۔ ان کا جوتا اس وقت کے لحاظ سے نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ گھر میں چپل کا استعمال کرتے، باہر نکلتے تو جوتا پہن کر نکلتے، خوشبو بہت پسند تھی۔ اس لیے اس کا بھی کثرت سے استعمال کرتے اور عطر کی شیشی ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتے تھے اور ایک اچھی عادت یہ بھی تھی کہ اپنا کام خود کرتے تھے، کبھی کسی دوسرے سے اپنا کام کروانا پسند نہیں کرتے، یوں تو ان کی شخصیت بڑی بارعب تھی، مگر اپنا رعب کبھی دوسروں پہ نہیں جماتے تھے۔

کھانے پینے کا معمول

یوں تو ان کی زندگی اسباب کی قلت اور بے سروسامانی میں گذری، اس لیے کھانا ہمیشہ سادہ کھاتے، مگر کبھی کبھی اس کا بھی اہتمام کرتے اور ویسے وقت پر جو میسر آتا اسے نعمت خداوندی سمجھ کر نوش فرما لیتے اور انہیں کبھی بھی کھانے کے تکلفات سے رغبت نہیں رہی۔

قاضی صاحب ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' میں رقم طراز ہیں: ''مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کی مدرسی کے دوران کبھی ایسا وقت بھی آیا کہ آٹا گھول کر اور نمک کے ساتھ لگا کر وقت کاٹ لیا گیا اور بسا اوقات سالن کی جگہ لیمو، پیاز اور مرچ و نمک ملا کر سلاد کا استعمال کیا اور کبھی ایسا ہوتا کہ ایک آنے کا گڑ (بھیلی) صبح کو لاتا اور چائے بن جایا کرتی تھی اور رات کی بچی ہوئی روٹی ناشتے میں کام آتی اور بعض اوقات اس کا بھی انتظام نہیں ہوتا''۔[۸۳]

قاضی ظفر مسعود صاحب جو قاضی صاحب کے بیٹے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ''والد صاحب کھانا نہایت سادہ کھاتے، کبھی دو سالن ایک ساتھ تناول نہیں فرماتے، بلکہ دسترخوان کی بہت سی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، ہم لوگوں کے ضد کرنے پر بھی منع کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم لوگ اس معاملے میں میرا خیال بالکل مت کیا کرو۔ ہمارے صحابہ کرام کیسی کیسی روکھی پھیکی کھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ہم لوگ ہر وقت پیٹ بھرنے کے چکر میں رہتے ہیں''۔[۸۴]

ازدواجی زندگی

مولانا قاضی صاحب کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار رہی۔ قاضی صاحب کو حالات

اور مصلحت کے تحت دوشادیاں کرنی پڑیں، کیونکہ ان کی پہلی اہلیہ صاحبہ ان کے استاد محترم مولوی نعمت اللہ صاحب کی بیٹی تھیں۔ مگر ایک دوبار ہی رخصتی کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔

دوسری شادی محمد یعقوب صاحب کی بیٹی سائرہ خاتون سے ہوئی، یہ ولید پور ضلع مئو کی رہنے والی تھیں۔ یہ بڑی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں، زندگی کے دکھ سکھ بخوشی برداشت کرتی رہیں مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ اس کی وجہ ان کی مادری تربیت تھی، وہ خود بھی نہایت صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور قاضی صاحب کی والدہ کی طرح اپنے گھر پر محلے کے بچوں کو قرآن مجید اور دینی تعلیم کی تربیت دیتیں۔ انھوں نے دوبار حج بھی ادا کیا اور ۵ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔[۸۵]

اولاد

قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی اولاد میں چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، اپنے والد ماجد کی طرح ان کی اولاد نے بھی تعلیمی میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعلیمی سلسلہ ان کی اولاد سے بڑھ کر احفاد تک بھی پہنچ چکا ہے، سب کے سب تعلیم یافتہ اور صاحبِ صلاحیت ہیں۔ ان کے دو بیٹے شریف انور اور انور جمال صغر سنی میں ہی انتقال کر گئے۔

سب اولاد میں مولانا خالد کمال صاحب سب سے بڑے تھے، ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ہے۔ وہ ذہانت وفطانت حتی کہ شکل وصورت میں بھی اپنے والد ماجد سے مشابہت رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں پائی اور ۱۹۵۸ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت پائی اور ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور کلیۃ الشریعۃ سے تعلیم مکمل کی۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ سے ۱۹۶۷ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد سعودی حکومت کی طرف سے مغربی افریقہ گھانا میں دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے مامور کیے گئے۔ وہاں انھوں نے چودہ سال تک علمی ودینی فریضہ انجام دیا۔

اسی زمانے میں خالد کمال کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر حج سے روکا تھا، افریقہ (گھانا) سے ہی انھوں نے اپنے والد ماجد (قاضی اطہر) کے نام سے انگریزی میں ماہنامہ ''اطہر'' جاری کیا اس میں دینی وتبلیغی مضامین ہوتے تھے اور وہ ماہنامہ کافی مقبول ہوا تھا۔

سعودی حکومت نے خالد کمال کی دینی وعلمی تبلیغ دیکھ کر ۱۹۸۱ء میں ان کا تبادلہ نیوزی لینڈ میں کر دیا۔ نیوزی لینڈ میں انھوں نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کر کے اس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی۔ ۸۶ (وہ مسجد نیوزی لینڈ کی راجدھانی ویلینگٹن میں ہے) مولانا خالد کمال صاحب میں بہت سی علمی وادبی خوبیاں تھیں اس کے علاوہ شعروشاعری کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے پندرہ مرتبہ حج ادا کیا اور ۱۹۹۹ء میں ہی نیوزی لینڈ میں انتقال ہوا اور اسی سرزمین میں پیوندِ خاک ہوئے۔ ۸۷

خالد صاحب کے قائم کردہ اسلامک سینٹر میں آج بھی ان کے داماد مولانا محمد مبارک پوری قاسمی (مبعوث) کام کررہے ہیں۔ یہ مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہیں۔

قاضی صاحب کے دوسرے فرزند ظفر مسعود صاحب یکم دسمبر ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور سے حاصل کی۔ پھر مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے عالمیت کا امتحان پاس کیا، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے استاد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مولانا فخر الدین صاحب نے ان کی علمی لیاقت و ذہانت سے خوش ہو کر انھیں خصوصی سندِ حدیث سے نوازا تھا۔ ۸۸ ظفر صاحب نے اور بھی دینی وعلمی کارنامے انجام دیے۔ مبارک پور میں انصار گرلس انٹر کالج کے بانیوں میں سے ہیں۔ انھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص لگاؤ ہے۔ ۸۹

تیسرے صاحب زادے قاضی سلمان مبشر صاحب ہیں جو بقید حیات ہیں، ان کی ولادت ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ انھوں نے بھی اپنے والد صاحب اور دیگر بھائیوں کی طرح ابتدائی تعلیم اسی مدرسے (احیاء العلوم مبارک پور) سے ہی حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۷۲ء میں فراغت حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے، ۱۹۷۸ء میں فراغت کے بعد سعودی حکومت کی طرف سے مغربی افریقہ تشریف لے گئے، وہاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ چودہ سال تک قیام کیا، اس درمیان دینی وملی اور قومی خدمت انجام دیتے رہے، ۱۹۹۲ء میں حکومت کی طرف سے تبادلہ ہونے پر ہندوستان تشریف لائے اور مختلف مدارس میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھوں نے جین پور اعظم گڑھ کے مدرسہ جامعۃ البنات میں بحیثیت استاد حدیث، فقہ اور عربی ادب کی تعلیم دی اور اب اعظم گڑھ کے قصبہ انجان شہید میں تدریسی

خدمت انجام دے رہے ہیں۔اب تک چھ بار حج بیت اللہ ادا کر چکے ہیں اور اپنے والد صاحب کے علمی کارناموں کو وسعت دینے میں لگے ہوئے ہیں، جو کتابیں اشاعت سے محروم تھیں ان کی اشاعت اور بقیہ کتابوں کے جدید ایڈیشن کے سلسلے میں کوشاں وسر گرداں ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے عزائم کو پورا کرے۔

قاضی صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد ہیں۔انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم مبارک پور کے مدرسہ احیاء العلوم سے ہی حاصل کی۔اس کے بعد شبلی کالج اعظم گڑھ سے بی-اے (B.A) کی ڈگری حاصل کی اور اس وقت انصار گرلس انٹر کالج میں کلرک ہیں۔

قاضی صاحب کی سب سے بڑی صاحب زادی امۃ الرحمٰن ام سلمٰی، ان کی تاریخ پیدائش یکم مارچ ۱۹۴۸ء ہے۔ان کی شادی ماسٹر مصباح الدین محمد رافع صاحب سے ہوئی (یہ محمد آباد گنہ ضلع مئو کے رہنے والے ہیں) اور فیروز آباد میں مقیم ہیں۔پہلے یہ ۱۹۶۷ء میں اسلامیہ انٹر کالج فیروز آباد میں بائیلوجی کے لیکچرار تھے اب اسی کالج میں ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔

موصوف کی دوسری بیٹی شمیمہ عائشہ ماسٹر رضوان صاحب سے منسوب ہیں۔یہ نوادہ مبارک پور کے رہنے والے ہیں۔انھوں نے علی گڑھ سے بی-اے (B.A) کیا اور اس کے بعد ملک سعودی یونیورسٹی ریاض (سعودی عرب) سے اپنی تعلیم مکمل کی۔

اعزازات

مولانا قاضی اطہر کی بے لوث علمی خدمات اور قلمی کاوشوں کے صلے میں انھیں بہت سے اعزازات حاصل ہوئے، سب سے پہلا اعزاز ۱۹۸۵ء میں ۱۵/ اگست کو عربی خدمات اور علمی و تحقیقی کاموں کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ کی طرف سے سندِ توصیف "کشمیری چادر" اور تاعمر سالانہ پانچ ہزار روپیے کا وظیفہ عطا ہوا اور پھر اس وظیفے کی رقم ۱۹۸۸ء میں بڑھ کر ۱۰ ہزار ہوگئی تھی جو تا حیات قائم رہی۔یہ حکومت ہند کا بڑا اعزاز تھا۔جس کو علمی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔قاضی صاحب کے شاگرد محمد عثمان معروفی صاحب نے اس اعزاز کو اس طرح منظوم کیا ہے۔

قاضی اطہر تو اک بحر ہے بیکراں — تیری خدماتِ علمی بروں از بیاں
اہل علم و حکومت کو تسلیم ہیں — تیری تصنیف و تالیف کی خوبیاں

تیرا موضوع ہند و عرب رابطہ　　تو مؤرخ ہے اسلام کا نو جواں
ہو مبارک حکومت کا ایوارڈ　　تحفۂ علم و عزّت کا روشن نشاں
جشنِ ایوارڈ کا لکھ دے عثماں سنہ　　وسعتِ کلک کا تو ہے سیل رواں ۸۹

۱۹۸۰ء میں قاضی صاحب کو اسلام آباد (پاکستان) میں تیسری عالمی قرآن کانفرنس میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے مولانا کو علمی و تحقیقی خدمات کی بنا پر تحفے تحائف سے نوازا۔ ۹۰

۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر ونظر نے (سکھر سندھ پاکستان) کی دعوت پر گئے تو محمد ضیاء الحق (مرحوم) نے انہیں سندھ کی روایتی ٹوپی اور تنظیم فکر ونظر کا اعزازی نشان بھی دیا۔ ۹۱

۱۹۸۶ء میں پاکستان (سندھ) میں ایک سمینار کے موقع پر تشریف لے گئے تو وہاں کئی یونیورسٹیز/ جامعات کے ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے اعزاز میں پر تکلف تقریب کا اہتمام کیا۔ ۹۲

اس تقریب میں قاضی صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ ان دانشوروں نے ان کے علمی کارناموں وخوبیوں کو کما حقہ سراہا اور گومل یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر ذیشان نے قاضی صاحب کے علمی کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو شاندار لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد مولانا کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی عزت افزائی کی اور احسان شناسی کے صلے میں انھیں محسنِ سندھ کے خطاب سے نوازا۔ ۹۳

قاضی صاحب کے یہ تمام اعزازات ان کی علمی لیاقت کی زندہ مثال ہیں اور ساتھ ہی قابلِ فخر بھی اور ایسا فخر جو ہر انسان کو میسّر نہیں ہوتا۔

تلامذہ

قاضی اطہر صاحب کے تلامذہ میں سے چند شہرت یافتہ لوگوں کے نام اس مقالہ میں شامل کیے گئے ہیں۔

یوں تو مولانا نے شاذ و نادر ہی مدارس میں تدریسی خدمت انجام دی، باضابطہ یا مستقل طور پر درس و تدریس کا کام نہیں کر سکے۔ ان کی تدریسی مدّت صرف سولہ یا سترہ سال رہی۔ اس کے علاوہ خواہش مند لوگوں نے ان کے گھر پر بھی جا کر تعلیمی استفادہ کیا اور کچھ لوگوں کو قاضی صاحب نے خود ان کے گھر جا کر درس دیا اس لیے اس باب میں تینوں قسم

کے شاگردوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۱) **مولانا محمد عثمانی معروفی صاحب (مرحوم)**

انھوں نے قاضی صاحب سے مقاماتِ حریری کا درس لیا اور انھیں کی رہنمائی میں مضمون نگاری بھی سیکھی۔ قاضی صاحب کی ذات سے انھیں بے شمار فائدہ پہنچا آگے چل کر یہ ایک اچھے مدرس، بہترین خطاط و شاعر اور قابل عالم بنے۔ انھوں نے قاضی صاحب کے سندھی اعزاز کو ایک منظوم صورت میں پیش کیا، جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔

(۲) **مولانا اعجاز احمد اعظمی**

انھوں نے قاضی صاحب کے گھر حاضر ہو کر ''مقامات حریری'' کا درس لیا، جس سے ان کی عربیت و ادبیت میں زبردست اضافہ ہوا۔

مولانا اعجاز صاحب بھیر، ضلع مئو کے رہنے والے ہیں اور شیخو پور کے مدرسہ شیخ الاسلام کی قیادت انھیں کے ہاتھوں میں ہے، یہ ایک اچھے معلّم و مربی ہیں، مولانا اعجاز صاحب ماہنامہ ضیاء الاسلام کے مدیر بھی ہیں اور اعلیٰ درجے کے مصنف بھی۔ ایک علمی و دینی رسالہ اس رسالے کا قاضی اطہر نمبر بھی شائع ہوا، جو کافی مقبول ہوا۔

(۳) **ملا محمد یونس شکیب مبارک پوری (مرحوم)**

یہ بوہرہ تھے اور بوہری مسلک میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں اردو، عربی اور گجراتی تینوں زبانوں میں عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ان کی کئی تصانیف بھی ہیں جن کا علم تو نہیں ہو سکا، مگر لوگوں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا من وعن بیان کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو ان کی تصانیف حاصل ہو۔

ملا محمد یونس صاحب کا ایک ادارہ بھی تھا جس کا نام ''ادارہ ادبیات فاطمی'' تھا یہیں سے بوہرہ کی مذہبی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ یونس شکیب صاحب نے قاضی صاحب سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی، اس کے علاوہ مختلف مدارس سے تکمیل تعلیم کی اور کئی مدارس میں تدریسی خدمت بھی کی اور تصنیفی و تبلیغی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور افریقی ملک ماریشیش میں اقامت اختیار کی مگر انتقال سے چند روز پہلے مبارک پور تشریف لے آئے۔

(۴) **محمد احمد غریب (مرحوم)**

انھوں نے قاضی صاحب سے ریاض الصالحین کا درس لیا، بلکہ اسے دوبار پڑھا

اور حدیث صحیح مسلم بھی انھیں سے پڑھیں اور بعض دوسری احادیث کا درس بھی لیا۔

محمد احمد صاحب میمن برادری سے تعلق رکھتے تھے، یہ بہت بڑے تاجر تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ خیر واصلاح اور تقویٰ کا جذبہ بھی رکھتے تھے اور یہ مسافر خانہ صابو صدیق میں انجمن خدام النبی کے روح رواں تھے۔ ان کے دینی و اصلاحی، فلاحی و قومی رفاہ عامہ کے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے قمر الزماں صاحب لکھتے ہیں کہ "آزادی کے بعد جب مسلم اقلیت مسائل کی ریگستانی دھوپ میں ایک معمولی خیمے کی محتاج بنادی گئی تھی جس کے نتیجے میں وہ ایک ذہنی وروحانی یاست زدگی کی شکار ہوگئی تھی اس دور میں مسلم عزائم کے تمام راستے مسدود کردیے گئے تھے، لیکن محمد احمد غریب اور ان کے بھائیوں کی خوش حالی و سرمایہ داری ابر نیساں بن کر قوم کی شادابی کا سامان کرتی رہی ان کی فیاضیوں اور کشادہ دلی کی علامتوں میں دینی تعلیمی کنونشن ممبئی منعقدہ ۱۹۵۵ء اہم ہے۔ جس نے مسلمانانِ ہند کے ذہنی وفکری اور تعمیری و تعلیمی رخ کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(۵) مولانا بدرالدین اجمل قاسمی صاحب

یہ بھی قاضی صاحب کے خصوصی شاگردوں میں سے ہیں۔ انھوں نے موصوف سے مدرسہ امدادیہ چونا بھٹی میں تعلیم پائی، یہ تجارت میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لیے ایک کامیاب تاجر بھی ہیں اور عطر کی تجارت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادارہ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی ہیں اور شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے فعال ڈائرکٹر بھی اور آج بھی یہ قاضی صاحب کے بچوں سے تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔

(۶) یونس اگاسکر

یہ ممبئی کے رہنے والے تھے، انھیں ممبئی میں قاضی صاحب کی شاگردی حاصل ہوئی اور یہ اپنے زمانہ کے زبردست عالم بھی ثابت ہوئے۔ انھیں مراٹھی اور اردو زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ یہ اردو کے مشہور محقق و ناقد بھی تھے اس کے ساتھ ساتھ سماجیات و لسانیات پر عمدہ مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بھیونڈی میں حاصل کی اور ہائی اسکول والیس، ایس، سی کرنے کے بعد ممبئی یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں اردو عربی میں بی، اے، کیا اور ممتاز نمبروں سے کامیابی ملنے پر انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔

۱۹۶۷ء میں انھوں نے جرنلزم کا ڈپلوما بھی کیا اور ۱۹۶۹ء میں سماجیات سے

ایم،اے کیا اور ۱۹۷۰ء میں اردو و فارسی سے مکرر ایم،اے کیا،اسی دوران انھوں نے قاضی صاحب سے فارسی کا درس لیا۔

۱۹۷۴ء میں ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان لنگوسٹکس بھی کیا۔ ''اردو کہاوتوں کے سماجی ولسانی پہلو'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی-ایچ-ڈی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی۔ انھیں مصروفیات کے ساتھ انھوں نے تصنیفی اور اصلاحی کام بھی کیا۔ ''بنیادی ہندوستانی لغت'' پروجیکٹ پر کام کیا اور ''بنیادی ہندوستانی'' کی ریڈرس بھی تیار کیں اور مختلف ادبی وتنقیدی، سماجی، لسانی موضوعات پر قلم اٹھایا اور بہت سے افسانے بھی لکھے۔ ماہنامہ ''نقش کوکن'' کے مدیر اور ماہنامہ ''شاعر'' کے معاون مدیر رہے۔ یہ دونوں رسالے ممبئی ہی سے شائع ہوتے تھے۔ ان کی تصانیف میں ''مراٹھی ادب کا مطالعہ'' ان کی علمی لیاقت کا بیّن ثبوت ہے۔

(۷) عبدالرزاق قریشی (مرحوم)

عبدالرزّاق قریشی موضع بلہم ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ یہ اردو کے بہترین محقق ہونے کی وجہ سے ممبئی کے علمی وادبی حلقوں میں بھی کافی معروف تھے۔ ممبئی کے انجمن ہائی اسکول سے متعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں برسر روزگار تھے اور اس میں شائع ہونے والے علمی وتحقیقی جریدہ کے بھی مدیر تھے، انھوں نے قاضی صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کر کے اس زبان میں بہترین لیاقت پیدا کر لی۔

(۸) مولانا عبدالحنّان صاحب

انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم میں قاضی صاحب سے نحو وصرف کا درس لیا اور پھر مظاہر العلوم میں بھی تعلیم پائی اور دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۵۴ء میں فراغت حاصل کر کے صوبہ بنگال کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، مدرسہ قرآنیہ اور مدرسہ حسینیہ جونپور میں منطق وفلسفہ، اصول، فقہ، نحو وصرف، عربی وانشاء کی تعلیم دی اور اس کے علاوہ مدرسہ احیاء العلوم میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں اور اس وقت جامعہ رشیدیہ بھور ضلع اعظم گڑھ کے ناظم ہیں۔

(۹) مولانا عبدالرؤف مبارک پوری

یہ بہت بڑے عالم دین ہیں اور پرانے نصابِ تعلیم کے شرائط پر حاوی علم رکھنے

والے بھی اور اردو کے بہترین شاعر بھی ہیں۔ یہ مفتی ہونے کے ساتھ فتویٰ وغیرہ میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے نامور اساتذہ میں سے ہیں، انھوں نے قاضی صاحب سے شاگردی کا شرف حاصل کیا۔

(۱۰) مولانا مفتی ظہور احمد خاں صاحب

یہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبۂ افتاء کے صدر ہیں۔ انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ قاضی صاحب کے خصوصی شاگردوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ندوہ سے فراغت حاصل کی اور وہیں (ندوہ) افتاء اور تدریسی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ فی الحال یہ ندوہ کے مفتی، مدرس اور نائب مہتمم ہونے کے ساتھ شعبۂ تعمیرات کے ناظم بھی ہیں۔

(۱۱) مولوی محمد شعیب محشر صادقی (مرحوم)

یہ اعظم گڑھ کے ایک تاریخی قصبہ اکلام آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ صحافی اور شاعر تو تھے ہی اردو کے اچھے ادیب بھی تھے۔ موصوف مولانا عبد الحمید صدر جمعیۃ العلماء ضلع اعظم گڑھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب کی تدریسی خدمت سے استفادہ کیا، بلکہ یوں کہا جائے کہ انھوں نے قاضی صاحب کے چشمۂ علم سے اپنی علمی پیاس بجھائی تو زیادہ مناسب ہوگا۔

ان کے درس کے سلسلے میں یہ معلومات نہیں حاصل ہوسکیں کہ انھوں نے کون سا مضمون قاضی صاحب سے پڑھا۔

(۱۲) مولانا قمر الدین رسول پوری (مرحوم)

انھوں نے بھی قاضی صاحب سے شاگردی کا امتیاز حاصل کیا، یہ مدرسہ منبع العلوم ضلع مئو کے لائق اساتذہ میں سے تھے اور مدرسہ احیاء العلوم کے نائب ناظم بھی رہ چکے تھے اور انھوں نے مدرسہ حجازیہ میں بھی تدریسی خدمت انجام دی۔

(۱۳) مولانا محمد عوف پینتے پور (مرحوم)

یہ ضلع سیتاپور کے قصبہ پینتے پور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب سے کافی استفادہ کیا اور ان کے خصوصی شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ بہترین مدرس و مقرر اور خطیب تھے۔ انھوں نے مدرسہ تعلیم القرآن پینتے پور کا اجراء کیا اور اس کے ذمہ دار

بھی وہی تھے۔ موصوف کافی نیک اور صالح تھے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو دینی، اصلاحی اور تبلیغی وملامی سرگرمیوں میں صرف کیا۔

(۱۴) **مولانا عبدالکریم صاحب**

یہ اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ابراہیم پور کے رہنے والے ہیں اور قاضی صاحب کے خصوصی شاگردوں میں شامل ہیں۔

موصوف نے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور سے تکمیل تعلیم کی اور مختلف مدارس میں تدریسی خدمت کی۔ پھر بنگال چلے گئے، یہ قاضی صاحب کے فرزند سلمان مبشر صاحب کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں بیر ہونگ چلے گئے اور تقریباً تیس سال تک وہاں مدرس رہے۔ ضعیفی وکمزوری کے سبب آج کل گھر پر ہی اپنی زندگی کے شب وروز گذار رہے ہیں۔

حوالے

۱۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبع ثانی، ص ۱۰۱، ۱۹۷۰ء

۲۔ ڈاکٹر حبیب اللہ، اعظم گڑھ کا علمی، ادبی اور تاریخی پس منظر، نیوروبی پریس، پرنٹنگ پریس، نئی دہلی، ص ۱۲، ۲۰۰۴ء

۳۔ حبیب الرحمٰن جگدیش پور، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ''مقدمہ''، ص ۲۶، ۱۹۷۶ء

۴۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبع ثانی، ص ۵۳، ۱۹۷۶ء

۵۔ ایضاً، ص ۵۱

۶۔ محمد بنی عباس چریاکوٹی، احسن الانساب (مخطوطہ)، ص ۱۷، بدون سن

۷۔ حبیب الرحمٰن جگدیش پور، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ص ۱۷۔ ''مقدمہ'' قاضی اطہر مبارک پوری، ص ۲۵، ۱۹۷۶ء

۸۔ ڈاکٹر حبیب اللہ، اعظم گڑھ کا علمی، ادبی اور تاریخی پس منظر، نیوروبی پریس، پرنٹنگ دہلی، ص ۱۷، ۲۰۰۴ء

۹۔ سہیل اقبال، کلیات سہیل، مطبوعہ لمیٹڈ ملاس روڈ بمبئی، اشاعت اول، ص ۲۴۳، ۱۹۸۸ء

۱۰؎ اعظم گڑھ گزیٹر، ص ۱۶ تا ۱۶۱، ۱۹۱۱ء، بحوالہ مآثر و معارف مطبع یونین پریس دہلی، ص ۳۴، ۱۹۷۱ء

۱۱؎ قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، رحیمی پریس ممبئی، ص ۵۰، ۱۹۷۴ء

۱۲؎ ایضاً، ص ۶۰، ۶۱

۱۳؎ صدر رنگ، مطبوعہ جعفر لائبریری، مبارک پور، ص ۱۷، ۱۹۷۰ء

۱۴؎ قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، ص ۴۲، ۱۹۷۴ء

۱۵؎ قاضی اطہر مبارک پوری، مآثر و معارف، مطبع یونین پریس دہلی، ص ۳۴۴، ۱۹۷۱ء۔ ''راجہ حامد شاہ مانک پوری قطب عالم حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ راجہ حامد شاہ نے شیرازِ ہند پورب کو اپنا روحانی مرکز بنا کر سلاطینِ شرقیہ کے دور میں دہلی ثانی جون پور میں دین و دیانت کی بزم سجائی انھیں کی اولاد میں ایک بزرگ حضرت راجہ سید میاں شاہ تھے۔

۱۶؎ قاضی اطہر مبارک پوری، علی و حسین، ناشر اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ص ۲۹۲، ۲۰۰۷ء

۱۷؎ تذکرہ نویسوں میں مولانا محمد عثمان معروفی صاحب، مولانا اعجاز احمد صاحب، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولانا نورالحسن راشد صاحب، قاری ابوالحسن صاحب، نعیم احمد صدیقی صاحب، مولانا عبداللہ رؤف احمد صاحب شامل ہیں۔

۱۸؎ قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، ص ۱۸۹، ۱۹۷۴ء

۱۹؎ ایضاً، ص ۱۷۸

۲۰؎ ایضاً، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷

۲۱؎ ایضاً، ص ۱۸۵

۲۲؎ ایضاً، ص ۲۶۱ تا ۲۶۴

۲۳؎ ایضاً، ص ۲۵

۲۴؎ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خود نوشت سوانح)، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹڈ، دہلی، ص ۲۶، ۲۰۰۳ء

۲۵؎ ایضاً، ص ۴۶

قاضی اطہر مبارک پوری، مآثر و معارف، مطبع یونین پریس دہلی، ص ۳۶۱، ۱۹۷۱ء
قاضی اطہر مبارک پوری، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (سوانح حیات)،
فرید بکڈ پو، ص ۲۲، ۲۰۰۳ء
ایضاً، ص ۳۰
ایضاً، ص ۳۰، ۳۱
ایضاً
ایضاً
ایضاً، ص ۳۲
حاشیہ فتاوی احیاء العلوم، مبارک پور، ص ۴۰، بدونِ سن
ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، وفیات نمبر، ص ۳۲، ۱۹۹۶ء
ایضاً، ص ۳۲
قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خود نوشت سوانح)، فرید بکڈ پو،
پرائیوٹ لمیٹڈ، دہلی، ص ۲۹، ۲۰۰۳ء
فتاوی احیاء العلوم، مبارک پور، ص ۴۸، بدونِ سن
معلومات برائے مولانا عبدالمجید صاحب، ۱۶ اپریل، ۲۰۰۷ء
قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، رحیمی پریس، بمبئی، ص ۲۲۵، ۱۹۷۴ء
ایضاً، ص ۲۲۶
ایضاً
فتاوی احیاء العلوم، مبارک پور، ص ۲۰، بدونِ سن
قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، رحیمی پریس، بمبئی، ص ۲۲۷،
۱۹۷۴ء
ایضاً، ص ۲۲۰
ایضاً، ص ۲۲۴
سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، طبع ثانی، بھارت آفسیٹ، دہلی،
ص ۱۵۱، ۱۹۹۳ء

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۴۸۔ ماہنامہ ندائے شاہی، مرادآباد، ص ۲۳۶، ۱۹۹۹ء

۴۹۔ تاریخ شاہی نمبر، ص ۴۰۲

۵۰۔ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، طبع ثانی، بھارت آفسیٹ، دہلی، ص ۱۰۵-۱۰۸، ۱۹۹۳ء

۵۱۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات مع قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، فرید بکڈپو، ص ۲۲، ۲۰۰۳ء

۵۲۔ ایضاً، ص ۸۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۵۴۔ ایضاً، ص ۴۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۰

۵۶۔ مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے ''تعارف مؤلف''، کاکوری آفسیٹ لکھنؤ، ص ۲۴، ۲۰۰۵ء

۵۷۔ مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی، ماہنامہ ضیاء الاسلام، شیخوپور اعظم گڑھ، ص ۲۰۸، ۲۰۰۳ء

۵۸۔ مجلہ ترجمان الاسلام، بنارس، (قاضی اطہر نمبر)، ص ۶۰، ۱۹۹۶ء

۵۹۔ قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے، قاضی اطہر اکیڈمی، لکھنؤ، ص ۳۶ تا ۵۶، ۲۰۰۵ء

۶۰۔ ایضاً

۶۱۔ ایضاً

۶۲۔ قمر الزماں مبارک پوری، معارف القرآن، حصہ اول، قاضی اطہر مبارک پوری، ''تعارف مصنف'' کتب خانہ فیض ابرار انکلیشور، ص ۱۲، ۲۰۰۶ء

۶۳۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خود نوشت سوانح)، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹڈ، دہلی، ص ۱۲۶، ۲۰۰۳ء

۶۴۔ قمر الزماں مبارک پوری، مئے طہور، قاضی اطہر مبارک پوری کا مجموعہ کلام، طبع اول، مطبع علاء الدین چشتی کمپیوٹر پوائنٹ، نزد نگر پالیکا مبارک پور، ص ۷۶، ۲۰۰۶ء

۶۵ے قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خود نوشت سوانح)، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹڈ، دہلی، ص۱۸۵، ۲۰۰۳ء

۶۶ے قمر الزماں مبارک پوری، مئے طہور، قاضی اطہر مبارک پوری کا مجموعہ کلام، طبع اول، مطبع علاءالدین چشتی کمپیوٹر پوائنٹ نزد گرلس کالج مبارک پور، ص۷۸-۷۹، ۲۰۰۶ء

۶۷ے مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ص۳-۴، ۱۹۹۶ء

۶۸ے مولانا ضیاءالدین اصلاحی، ماہنامہ ضیاءالاسلام شیخوپور اعظم گڑھ، ص۲۸۵، ۲۰۰۳ء

۶۹ے ایضاً

۷۰ے عبدالمجید مبارک پوری (قاضی صاحب کے چچازاد بھائی) سے زبانی معلومات، ۲۰۰۸ء

۷۱ے مولانا اسیر ادروی، ترجمان الاسلام، بنارس، (قاضی اطہر نمبر) ص۳۹، ۱۹۹۶ء

۷۲ے مولانا اسیر ادروی، ترجمان الاسلام، بنارس، (قاضی اطہر نمبر) ص۳۲، ۱۹۹۶ء

۷۳ے ظفر احمد صدیقی، ماہنامہ ضیاءالاسلام شیخوپور اعظم گڑھ، ص۲۲۰، ۲۰۰۳ء

۷۴ے قاضی اطہر مبارک پوری، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (سوانح حیات)، فرید بکڈپو، ص۲۲، ۲۰۰۳ء

۷۵ے ماہنامہ ضیاءالاسلام شیخوپور اعظم گڑھ، ص۲۰۳، ۲۰۰۳ء

۷۶ے مولانا اسیر ادروی، ترجمان الاسلام، بنارس، (قاضی اطہر نمبر) ص۳۲، ۱۹۹۶ء

۷۷ے قمر الزماں، مئے طہور، قاضی اطہر مبارک پوری کا مجموعہ کلام، ص۶۵، ۲۰۰۶ء

۷۸ے قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خود نوشت سوانح)، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹڈ، دہلی، ص۵۶-۵۸، ۲۰۰۳ء

۷۹ے مولانا ضیاءالدین اصلاحی، ماہنامہ ضیاءالاسلام شیخوپور اعظم گڑھ، ص۲۸۵، ۲۰۰۳ء

۸۰ے مولانا ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ حیات (خود نوشت سوانح)، ''قاضی اطہر معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں'' ص۵۶-۵۸، ۲۰۰۳ء

۸۱ے مولانا ضیاءالدین اصلاحی، ماہنامہ ضیاءالاسلام شیخوپور اعظم گڑھ، ص۲۸۶، ۲۰۰۳ء

۸۲ے قمر الزماں، مئے طہور، قاضی اطہر مبارک پوری کا مجموعہ کلام، ص۶۸، ۲۰۰۶ء

۸۳ے قاضی اطہر مبارک پوری، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، دائرہ ملّیہ مبارک پور، ص۲۶، ۱۹۸۷ء

۸۴۔ مولانا ظفر مسعود صاحب، زبانی معلومات، ۲۰۰۷ء

۸۵۔ سلمان مبشر صاحب، زبانی معلومات، ۵؍جولائی، ۲۰۰۷ء

۸۶۔ مولانا قمرالزماں مبارک پوری، معارف القرآن، حصہ اول، تعارف مصنف، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، کتب خانہ فیض ابرار انکلیشور، ص ۱۴، ۲۰۰۶ء

۸۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۸۸۔ ایضاً، ص ۱۶

۸۹۔ مولانا محمد عثمان صاحب معروفی، قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے، تعارف مؤلف، مطبع کاکوری آفسیٹ لکھنؤ، ص ۲۷، ۲۰۰۵ء

۹۰۔ مولانا اعجاز، ''قاضی صاحب اور اہل سندھ''، کاروانِ حیات مع قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، فرید بکڈپو، ص ۲۳۲، ۲۰۰۳ء

۹۱۔ ایضاً

۹۲۔ ایضاً

۹۳۔ ایضاً

☆☆☆

باب سوم

علمی و تصنیفی خدمات

قاضی اطہر مبارک پوریؒ کا شمار عربی اور اردو کے بالغ نظر محققین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی تحقیق و تصنیف کی نذر کردی اور سنگین حالات بھی ان کی دینی جدّ و جہد، احقاق حق اور ابطال باطل کی راہ میں پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ یوں تو ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کی موجوں کا نظارہ کرنے والوں کی تعداد کثیر ہوتی ہے، مگر ان موجوں کی ہولناکیوں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ چند ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کو ہر دور میں بآسانی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ انہی لوگوں میں قاضی صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔

موصوف کا عزم آہنی، ان کی ہمتِ فولادی، ان کی جدّ و جہد، ان کا عزم جواں ہمیشہ رواں پیہم دواں رہا، وہ جس مہم پہ چلے پورے جوش و خروش اور عزم و استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری بہت سی مصروفیات کے باوجود ان کی تصانیف کا دائرہ کافی وسیع ہے اور ان سے صرفِ نظر کرنا آسان کام نہیں۔ یوں تو تاریخ قاضی صاحب کا محبوب موضوع تھا مگر اس کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر انھوں نے بڑی دیانت داری اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اپنے علمی و ادبی اور تاریخی ذوق کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کے دوران تصنیفی ذوق سے روگردانی نہیں کی، بلکہ اسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس خدمت کو بھی بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ موصوف کی اسی خوبی کو مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب نے یوں سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”قاضی صاحب ان اکابرین و مشاہدین کی صف کی ایک ایسی ممتاز شخصیت تھے جو علمی موضوعات کے نادر انتخاب اور تصنیف و مؤلفات کے موضوع کی جامعیت نیز تحقیق و مطالعہ، وسعتِ نظر اور نادر معلومات و نتائج اخذ کرنے میں اپنے معاصرین میں بھی بے مثال تھے“۔[1]

قاضی صاحب نے مسلمانوں کے وہ ناگفتہ بہ حالات دیکھے تھے کہ ان کے معاشی، سیاسی، یہاں تک کہ مذہبی حالات بھی ابتری کی طرف تھے۔ ملک اور اہل ملک غلام تھے اور نہتے تھے، دوسری طرف ہتھیار بند قوم غالب تھی، عقائد کمزور ہوتے جا رہے تھے، الجھے ہوئے

خیالات سے دوچار قوم نفسیاتی طور پر بھی مجروح تھی۔ ان حالات میں آپ نے زبان وقلم سے ملک وملت دونوں کی خدمت کی، کسی حد تک یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایسے دور میں اسلام کو سربلند کرنے کی پوری کوشش کی جس وقت لوگ زبان اور قلم صحیح سمت میں چلانے پر سر قلم کر دیے جاتے تھے یا جیل میں ڈال دیے جاتے تھے۔ جس نے کوئی بھی ہمت کی اسے توڑ دیا جاتا تھا، ایسے وقت میں تصنیفی کام کرنے والی شخصیت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

لہٰذا قاضی صاحب کی تمام تصانیف اہمیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جتنی دقتیں اٹھائیں اس سے کہیں زیادہ ان کی تصانیف شہرت وناموری سے ہمکنار ہوئی، مسلمانوں کے خاص طبقوں میں ہی نہیں بلکہ عام طبقوں میں بھی ان کی تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کی تصانیف کی اہمیت وشہرت کی خاص وجہ قاضی صاحب کی وہ دعا بھی ہے جو انھوں نے آبِ زمزم پیتے وقت بارگاہِ ایزدی میں کی تھی۔ اس دعاء کو مولانا کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں کہ:

"تحدیثِ نعمت کے طور پر اس حقیقت کے اظہار کر دینے میں مجھے بڑی مسرت اور لذت محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے ۱۳۷۵ھ میں پہلے حج کے موقع پر مقدس مقامات اور بابرکت لمحات میں خاص طور سے آبِ زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ مجھے اسلامی علوم کے کسی خاص اور اہم شعبہ کی خدمت کی توفیق عطا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اسلامی ہند کی تاریخ مرتب کرنے کی توفیق سے نوازا اور ساتھ ہی کئی نادر موضوعات پر لکھنے کی سعادت بخشی"۔ [۲]

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بلند وبالا مرتبے پر فائز کیا اور انھیں اسلامی علوم وفنون پر لکھنے کی سعادت بخشی اور اقوامِ عالم میں ممتاز کیا۔ ان کی تصانیف کی اہمیت اور ان کی محنت و کاوش کا دنیا نے کھل کر اعتراف کیا۔ مولانا کی تمام تصانیف ایک گراں نقد خزینہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ذیل میں قاضی صاحب کی تصانیف کا اجمالی تعارف پیش خدمت ہے۔

اجمالی تعارف

(۱) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ

یہ کتاب قاضی صاحب کے آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے، جسے بعد میں کتابی شکل دی گئی، یہ دوسو اسّی صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۶۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے قوی دلائل کی روشنی میں کمزور حوالوں پر مبنی واقعات کی تردید کرتے ہوئے بحث ومباحثہ بھی کیا ہے اور اس کے علاوہ اس مجموعہ کے تمام مضامین میں قدیم فاتحین ہند سے لے کر قدیم ہندی علماء، فضلاء اور عرب وہند کے سیاسی وتہذیبی طرز معاشرت کو تاریخی دلائل سے ثابت کیا ہے، جو قابلِ صد تحسین اور لائقِ مطالعہ ہے۔ قاضی صاحب کی یہ تحریر تحقیقی ذوق کا کھلا ثبوت ہے، لکھتے ہیں:

> ''ہمارے مؤرخوں کے قول کو مان کر محمد بن قاسم کی عمر ۹۲ھ یا ۹۳ھ میں فتح ہندوستان کے وقت صرف سترہ سال تسلیم کرلی جائے تو ۸۳ھ میں جب کہ وہ فارس کے امیر بنائے گئے تھے ان کی عمر چھ، سات سال کی ماننی پڑے گی جو ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اس عمر میں کسی بچے کو ملک کی ولایت اور غزوات کی امارت تو دور کی بات ہے، گھر کی کوئی معمولی سی ذمہ داری بھی نہیں دی جاتی ہے''۔ ۳ے

مولانا کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد اہلِ علم حضرات نے اپنے اپنے بہترین تبصروں سے نوازا۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''قاضی اطہر مبارک پوری مدیر ماہنامہ ''البلاغ''، بمبئی کے ایک معروف ومستند اہل علم ہیں۔ جنھیں ان کے افادات کی وجہ سے بے اختیار ندوی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے۔ دنیائے عرب میں بھی

وہ متعارف ہو چکے ہیں اور اردو میں ان کے مقالات و تصانیف کا
ذخیرہ اب خاصا ضخیم ہو چکا ہے۔ پیش نظر کتاب ان کے آٹھ
مقالوں کا مجموعہ ہے اور ہر مقالہ ہندوستان کی قدیم تاریخ سے تعلق
رکھنے والا اور اپنے موضوع پر فاضلانہ بحث کرنے والا ہے''۔ ؎۴

(۲) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا بعد میں تنظیم فکر ونظر سندھ پاکستان نے اس کتاب کی جدید اشاعت کی۔ اس کی ضخامت تقریباً دو سو اسّی (۲۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

اس میں خلفاء راشدین کے عہد میں ہندوستان اور عرب کے تعلقات ان کے علم و ادب، معاشرت و تجارت اور سیاست و امارت کے سلسلے میں مفصل معلومات مہیا کی گئی ہیں اور ان کا تحقیقی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کتاب پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے یوں لکھا ہے:

''یہ اپنے موضوع پر ایک جامع و فاضلانہ کتاب ہے، اس میں
خلافت راشدہ سے ہندوستان میں صحابہ و تابعین کی آمد اور ان کے
حالات، جغرافیائی، تاریخی، سیاسی غرضیکہ ہر زاویہ سے ان پر نظر کی گئی
ہے۔ یہ کتاب تاریخ وسیر کی بیسیوں بلکہ پچاسوں کتابوں کا خلاصہ
اور لبّ لباب ہے اور معلومات کی ایک قاموس بھی جو خواص و عوام
دونوں کے لیے قابل مطالعہ ہے''۔ ؎۵

(۳) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان

یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے پانچ سو اٹھاون صفحات میں شائع ہوئی۔ تنظیم فکر ونظر نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس میں بھی تاریخ و رجال، طبقات و تراجم اور جغرافیائی حالات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو بھی علمی حلقوں میں قدر و منزلت حاصل ہوئی اسی لیے قاضی صاحب کے رفیق و ہمدم ڈاکٹر عبدالعزیز عزت نے اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا جو ''الھند فی العباسیین'' کے نام سے اٹھہتر (۷۸) صفحات میں دارالانصار قاہرہ (مصر) سے شائع ہوئی۔

(۴) خلافتِ بنوامیہ اور ہندوستان

۱۹۷۵ء میں یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی یہ تصنیف نوّے سالہ تاریخ پر مبنی ہے۔اس کی ضخامت ۱۷۶ صفحات پر محیط ہے۔

اس میں اموی دور کے اسلامی ہند کے غزوات، فتوحات اور اہم واقعات موجود ہیں ،جس میں اداراتی اور سرکاری انتظام، جنگی اور فوجی انتظام، ملکی اور شہری انتظام وغیرہ پر مکمل تبصرہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اموی امراء وحکام اور اس کے راجے مہاراجے، حتیٰ کہ ہندوستان کے مسلمان جو اصل میں ہندی تھے یا عربی،ان کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اسلامی علوم وفنون جیسے علم حدیث ومحدثین، مسلم وغیر مسلم کے تعلقات اور اس دور (اموی) کے تہذیب وتمدن، ان کے علمی وعملی، فکری ومعاشی اور معاشرتی میل جول کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس دور کے اعیان ورجال کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جس سے اموی دور کے اسلامی ہند کی صحیح اور مفصل تاریخ سامنے آتی ہے۔

اس کتاب میں ایک ہی بات کو کہیں مفصل تو کہیں مجمل اور کہیں کہیں اشارۃً بھی بیان کیا گیا ہے۔اس کی اصل وجہ تکرار کی ناپسندیدگی ہے۔

غرضیکہ قاضی صاحب نے اس کی تکمیل میں بڑی تحقیق وتدقیق سے کام لیا ہے اور مستند ومعتبر کتابوں سے اخذ واقتباس کر کے ان کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔

(۵) تذکرہ علماءِ مبارک پور

یہ کتاب قاضی صاحب کی پچیس سالہ تحقیق وتلاش کا ثمرہ ہے۔اس میں مبارک پور کی چار سو سالہ تاریخ، مدارس ومساجد اور شخصیات کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ مبارک پور کے اطراف وجوانب کے علماء ومشائخ کا ایک جامع تذکرہ مرتب کیا ہے اور بزرگانِ دین کے واقعات محدثین ومدرّسین، صحافی ،شعراء وادباء کے حالات وخدمات اور ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس سلسلے میں قاضی صاحب کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔علماء وفضلاء کے حالات جاننے کے لیے انھوں نے پیدل سفر بھی کیے اور ان کے متعلقین وواقف کاروں سے زبانی وتحریری معلومات حاصل کیں۔خود انھیں کی تحریر ملاحظہ فرمائیے۔لکھتے ہیں کہ:

"میں نے اس کتاب کی تالیف کے لیے معلومات حاصل کرنے میں
بڑی محنت کی ہے۔ اپنے بزرگوں کے حالات و تراجم کی تلاش میں
دن رات کی قید سے آزاد رہ کر آبادیوں اور ویرانوں کا چکر کاٹا ہے۔
محلوں اور جھونپڑوں میں آیا گیا ہوں۔ مزید لکھتے ہیں کہ "کسی بے
آب و گیاہ میدان میں چمن بندی آسان نہیں ہے۔ میں نے اس
شجرۂ مبارکہ کو بڑی محنتوں کے بعد شجر سایہ دار بنایا ہے"۔[۶]

یہ کتاب ۱۹۷۴ء میں رحیمی پریس سے طبع ہونے کے بعد دائرۂ ملیہ مبارک پور
بھی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی، اس وقت اس کی ضخامت ۲۹۲ صفحہ تھی لیکن ترمیم و اضافہ کے
۲۰۰۸ء میں جب دوبارہ شائع ہوئی تو ۳۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں قاضی
صاحب کے خاندان کے احوال بھی شامل ہیں۔ علامہ انور صابریؒ مرحوم نے اپنے اشعار
سے اس کتاب کی اہمیت اور بڑھا دی ہے۔ یوں تو اس میں پانچ شعر ہیں مگر یہاں صرف
ایک شعر ہی نقل کیا جا رہا ہے۔

جس میں پرتو ہے قرون خیر کے ایمان کا
ہوش کی آنکھوں سے تاریخ مبارک پور دیکھے

(۷) مآثر و معارف

مولانا قاضی اطہر کی یہ بیش قیمت کتاب پچیس مقالات کا مجموعہ ہے جو ندوۃ
المصنفین دہلی سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی اس میں تین سو کہتر صفحات ہیں۔ اس مجموعے کا
ہر مقالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ مولانا نے ان تمام مقالات
پر نظر ثانی کر کے ان کو جدید اضافات و معلومات سے مفید تر بنا دیا ہے۔ ابتداء کے تین مقالے
حدیث کی تدوین اور علوم حدیث کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ جس کے عناوین اس طرح ہیں:

(۱) تدوینِ حدیث کے چار ادوار
(۲) چند اہم اور مشہور کتب احادیث
(۳) علوم حدیث

مقالۂ اولیٰ میں قاضی صاحب نے چار ادوار قائم کر کے ہر ایک دور کی تفصیل
سے جامع انداز میں لکھی ہے۔ پہلے دور میں صحابہؓ اور اکابر تابعین کا عہد، عہدِ رسالت کے

چند تحریری سرمایوں کا تذکرہ ہے اور اس تذکرہ کے متعدد ذیلی عناوین ہیں۔ دوسرے دور میں تدوینِ حدیث کی ابتداء، اس دور کی خصوصیت اور مشہور کتابوں کا ذکر شامل ہے۔ تیسرا دور حدیث کی مستقل تدوین اور اس دور کی تدوینی خصوصیات، صحاح اور غیر صحاح تدوین کے علاوہ دیگر عناوین پر مشتمل ہے۔ چوتھے دور میں علم حدیث کی تنقیح وتہذیب، چوتھی صدی کی مشہور کتب احادیث، دورِ تہذیب کی جامع کتب احادث، احادیث کے احکام کی جامع کتابیں، صحت کے اعتبار سے کتب حدیث کی ترتیب وغیرہ عناوین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ قاضی صاحب نے اس کتاب میں تدوینِ حدیث، دارارقم کی علمی مرکزیت وحیثیت، تاریخ ورجال، فرقہ ومکاتب فکر، یورپ میں مسلمانوں کی علمی خدمات وغیرہ پر محققانہ نظر ڈالی۔ تدوین حدیث کے مضمون سے متعلق مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی فرماتے ہیں کہ: ''اس میں شامل مضمون میری تدریسی تقریر کے لیے بڑا معاون ثابت ہوتا ہے''۔[۸]

اس کتاب کے بقیہ مقالات کے عناوین یہ ہیں:

۱- چند اہم اور مشہور کتب احادیث

۲- علوم حدیث

۳- اسلامی تعلیم کا مکّی مرکز دارارقم

۴- مدارس اسلامیہ کے ارتقائی ادوار

۵- ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء

۶- علماءِ اسلام کے القاب

۷- امام محمد کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ

۸- امام محمد کی کتاب الآثار

۹- امام ابوبکر حمیدی مسند حمیدی

۱۰- امام سعید بن منصور خراسانی کی کتاب السنن

۱۱- فضل اللہ الصمد توضیح الادب المفرد

۱۲- مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا (سورہ یٰسین)

۱۳- قاضی رشید بن زبیر غسانی کی کتاب الذخائر والتحف

۱۴- ابن الانباری کی کتاب الاضداد فی اللغۃ

۱۵- ابواحمد عسکری کی کتاب المصون فی الادب

۱۶- امام ابوبکر مراغی کی کتاب تحقیق النصرہ
۱۷- المنجد پر ایک تنقیدی نظر
۱۸- استشراق اور مستشرقین
۱۹- ہنگری کے مستشرقین اور ان کے کارنامے
۲۰- اسپین میں امام ابن حزم کی نو سو سالہ یادگار تقریب
۲۱- فرقہ یزیدیہ
۲۲- فرقہ صابئہ کی ایک شاخ
۲۳- خانوادۂ نائبین قضاۃ مبارک پور
۲۴- لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ

یہ تمام علمی، تاریخی اور تحقیقی مقالات تقریباً بیس سال کی مدت (۱۹۴۹ء-۱۹۶۹ء) تک لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر مقالات مجلات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور بعض کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جو اس باب میں شامل ہیں۔

(۸) آثار واخبار

قاضی صاحب کی یہ کتاب دس مقالات کا مجموعہ ہے اور دو جلدوں میں منقسم ہے۔ پہلی جلد ۱۹۸۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی، لیکن دوسری جلد ابھی تک منتظر اشاعت ہے۔

جلد اول ایک سو پچاس (۱۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں قاضی صاحب کے چار مقالات ہیں جن میں تین مقالے ''آل عبدالرحمٰن بیلمانی، آلِ ابومعشر سندی مدنی اور آلِ مقسم قیقانی بصری'' کے علمی و دینی خانوادوں سے متعلق ہے، جو قدیم اسلامی ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خانوادے میں صدیوں تک علم دین کی سیادت وامامت باقی رہی۔

اور چوتھا مقالہ امام ابوالحسن مدائنیؒ وغیرہ کے حالات زندگی پر منحصر ہے۔ جو اسلامی ہند کے مورخ اول تھے۔ انھوں نے اسلامی ہند پر مستقل تین کتابیں: ''کتاب ثغر الہند، کتاب عمال الہند، کتاب فتح مکران،'' کے نام سے لکھیں۔

امام ابوالحسن مدائنی کے بارے میں ابن ندیم نے علمائے تاریخ وطبقات کا یہ قول نقل کیا ہے:

''مدائنی خراسان، ہندوستان اور فارسی میں دوسروں پر فائق ہیں اور ان کی سوا دو سو تاریخی تصانیف ہیں''۔ ۹

(۹) خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظامِ تعلیم و تربیت

تین سو بانوے صفحات پر مشتمل یہ کتاب شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند کی اشاعتی سرگرمیوں کی ایک اہم کڑی ہے۔ قاضی صاحب نے اس موضوع سے متعلق دو مضمون لکھے تھے۔ ایک ''اسلامی تعلیم کا مرکز دار ارقم'' اور دوسرا ''مدارس اسلامیہ کے ارتقائی ادوار'' یہ دونوں مضامین ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع ہوئے تھے پھر اسی موضوع سے متعلق ایک مضمون ''تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں'' لکھ کر اس میں وسعت پیدا کی۔ زیرِ تذکرہ کتاب میں یہ تینوں مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب دار العلوم دیوبند سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اور دوبارہ فرید بک ڈپو دہلی سے ۲۰۰۴ء میں طبع ہوئی ہے۔

(۱۰) ائمہ اربعہ

اس کتاب کی ابتداء قاضی صاحب کے زمانہ طالب علمی سے ہی ہوئی۔[۱۰]

اس میں مولانا نے چاروں امام یعنی (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کے معتبر اور مستند حالات کو اختصار کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۴۶ء میں مکتبہ تنظیم اہل سنت لاہور سے ہوئی۔ بعد میں ۱۹۸۹ء میں شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند نے اسے بڑی اہتمام سے شائع کیا، اس کتاب کی ضخامت دوسو پچپن صفحات ہے۔

(۱۱) بناتِ اسلام کی دینی و علمی خدمات

یہ کتاب ایک سو چار صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے بمبئی کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہٗ نے شائع کیا۔ دوسری مرتبہ دائرۂ ملیہ مبارک پور اعظم گڑھ سے اور تیسری مرتبہ اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔

قاضی صاحب نے اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل میں ان بناتِ اسلام کا تذکرہ ہے، جنھوں نے اسلامی اور دینی سرگرمیوں میں سعی و جہد کی اور علم کے حصول کے لیے دور دراز ممالک کے سفر بھی کیے۔ اس کے علاوہ گھر گھر جا کر بڑی بوڑھیوں سے علم حدیث کی معلومات کر کے مردوں تک یہ امانت پہنچائی۔ ان خواتین میں عالمات، فقیہات، محدثات، فاضلات بھی ہوتی تھیں۔ انھیں اس وقت مختلف دینی و علمی خطابات سے نوازا گیا۔

(١)	ست الاجناس	موفقیہ بنت عبدالوہاب، مصریہ
(٢)	ست الاہل	ام احمد بنت علوان بن سعید، بعلبکہ
(٣)	ست الشام	خاتون اخت الملک العادل
(٤)	ست الفقہاء	شریفہ بنت شرف الدین احمد بن محمد دمشقیہ
(٥)	ست الکل	بنت احمد بن محمد مکیہ
(٦)	ست الوزراء	بنت عمر بن اسعد تنوخیہ
(٧)	شجر الدّر	ام خلیل
(٨)	حُرہ	ام المؤید زینب بنت ابوالقاسم نیشاپوریہ
(٩)	جلیلہ	ام عمر خدیجہ بنت عمر بن احمد
(١٠)	معلّمہ	غالیمہ بنت محمد اندلیسہ

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے القاب وخطابات ہیں۔ جیسے شیخہ، زین الدّار، تاج النساء، فخر النساء، ست الناس وغیرہ وغیرہ۔[١١]

ان خواتین نے فقہ وفتویٰ، حفظ قرآن، تجوید وتفسیر، وعظ وتذکیر، شعر وادب اور خطاطی جیسے اہم کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور علم حدیث کی اشاعت میں درس و تدریس، تصنیف وتالیف کر کے اپنی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں عجیبہ بنت حافظ محمد بن ابوغالب، قداریہ بغدادیہ، ام محمد فاطمہ خاتون، خدیجہ بنت محمد شاہجانیہ وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''عجیبہ بنت حافظ نے اپنے اساتذہ وشیوخ حدیث کے حالات دس جلدوں میں لکھے تھے''۔[١٢]

''ام محمد فاطمہ نے الرموز ون الکنوز پانچ جلدوں میں لکھی۔''[١٣]

باب دوم میں طبقۂ صحابہؓ میں فقیہات، مفتیات اور محدّثات کا ذکر ہے جس میں امہات المومنین کے علم وتفقہ کو سراہا گیا ہے۔

درحقیقت یہ ایک نادر ونایاب کتاب ہے اس میں پیش کیے گئے واقعات نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔

(۱۲) خواتینِ اسلام کی علمی ودینی خدمات

یہ کتاب ''بناتِ اسلام کی علمی و دینی خدمات'' کا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے جو ایک سواسی صفحات پر مشتمل ہے، قاضی صاحب کے سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے کچھ دنوں پہلے ہی ۱۹۹۶ء میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی۔

پہلے یہ کتاب علمی و دینی خدمات کے نام سے طبع ہوئی تھی اس کے بعد اس میں اضافہ وترمیم کر کے اسے ''خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات'' کے نام سے شائع کیا۔

اس میں قرنِ اوّل کی ان خواتین اسلام کا تذکرہ ہے جنھوں نے حدیث وفقہ کی تعلیم و تعلّم کو آگے بڑھایا، ان میں محدّثات، فقیہات، مفتیات، عابدات، زاہدات، صوفیات سبھی ہیں۔ جنھوں نے علمِ دین کو گھر گھر پھیلانے کی بھرپور کوشش کی ہے اوران عورتوں سے مردوں نے بھی ایک حدتک تعلیمی استفادہ کیا ہے۔

(۱۳) اسلامی نظامِ زندگی

یہ کتاب چھوٹے سائز کے دوسوچھپن صفحات کی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں سلطانی پریس بمبئی نے اسے شائع کیا۔ دراصل یہ کتاب بناتِ اسلام کی دینی خدمات کا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے جو تیسری مرتبہ فرید بکڈ پو دہلی سے طبع ہوئی۔

اسے الحاج عبداللہ عسکری نے دو ہزار کی تعداد میں چھپوا کر اپنی مرحومہ بیوی کے ایصال ثواب کی غرض سے مفت تقسیم کیا اور اس کتاب کا ٹائٹل ''حیاتِ جمیلہ'' رکھا اور اب یہی کتاب ادارہ فیضان معرفت بلساڑ گجرات نے مارچ ۲۰۰۴ء مین طبع کیا جو بڑے سائز کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اس کتاب کی اشاعت سے میرے تعارف میں بڑی مدد ملی''۔[۱۴]

(۱۴) افاداتِ حسن بصری

یہ کتاب مدرسہ احیاء العلوم (مبارک پور) کی عارضی مدرسی کے دوران لکھی گئی تھی۔ اس کی پہلی اشاعت دائرہ ملّیہ مبارک پور سے ۱۹۵۰ء کو ۵۶ صفحات میں ہوئی تھی اور اشاعتِ ثانی مارچ ۲۰۰۵ء میں فرید بکڈ پو دہلی سے ہوئی۔ اس کے صفحات کی تعداد ستر ہے۔

اس میں حسن بصریؒ کی مختصر مگر جامع حالات زندگی اور ان کے ارشادات کو مؤثر

ے میں بیان کیا گیا ہے اور اس میں ان کے وعظ و نصائح، خطبات و مکاتیب اور اقوال
ں کو کافی تحقیق و تدقیق کے بعد جمع کیا گیا ہے۔

) مسلمان

یہ بھی ایک جامع رسالہ ہے، جو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جمعیۃ
ین بجیرہ نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ دیگر تصانیف کی طرح اس رسالے
ں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس رسالے کی اہمیت کی وجہ سے پانچ مرتبہ اس کی اشاعت ہوئی۔ پہلی بار جمعیۃ
ین بجیرہ ممبئی سے، دوسری مرتبہ ساجد لکھنوی نے شائع کیا۔ تیسری مرتبہ قاضی صاحب
پنی معلمی کے زمانہ میں انجمن اسلام ہائی اسکول کے طلباء کے لیے شائع کیا، چوتھی بار
ہ دینیہ غازی پور انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی مبارک پور نے ۱۹۷۶ء میں شائع
بعد ۲۰۰۴ء فرید بکڈ پو دہلی نے شائع کیا اور اب پھر ۲۰۰۶ء میں قاسم آباد انجان شہید
شائع ہوا۔ یہ رسالہ مہاراشٹر کے مختلف اسکولوں میں داخلِ نصاب کیا گیا ہے۔ اس کی
ں و افادیت کو دیکھتے ہوئے انگریزی میں بھی ترجمہ کرنے کی کوشش جاری ہے، تاکہ
یزی طبقہ داں بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔[15]

زیرِ تذکرہ رسالہ ''مسلمان'' اصل میں امام مالکؒ کے رسالہ ''مسلمان'' کا ترجمہ
امام مالکؒ نے اسے دوسری صدی ہجری کے سب سے بڑے حکمراں ہارون رشید
ں کے نام لکھا تھا۔[16]

حقیقت میں یہ رسالہ بہت ہی مدلل و موئثر ہے اور ہر پڑھنے والا اپنی زندگی کو بہتر
بہتر طریقے پر گذار سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسی طرح کے عناوین درج ہیں۔ اس میں
روزہ، زکوۃ، حج پر تفصیلی معلومات کے آداب زندگی سے متعلق جامع تحریریں موجود ہیں،
اضی صاحب نے حدیث و قرآن کی روشنی میں مدلل پیش کیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک
۲۔ تکبر کی حقیقت اور اس سے پرہیز
۳۔ اخلاص و خیر خواہی
۴۔ مظلوموں کی دادرسی
۵۔ کھانے پینے کے آداب

۶- سفر کے آداب

۷- سونے اور جاگنے کے آداب۔ وغیرہ۔

(۱۶) الصالحات

یہ صحابیاتؓ کے سبق آموز واقعات کا مجموعہ ہے، اسے مولانا نے خاص طور سے خواتین کے لیے لکھا تھا۔ اس کی سب سے پہلی اشاعت محمد عارف ملک دین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور سے ہوئی۔

محمد عارف ملک دین نے اشاعت کے بعد اس کتاب کو پچاس روپے میں خرید لیا اور قاضی اطہر صاحب سے ایک تحریر لکھوائی، وہ تحریر اس طرح تھی۔

"مبلغ پچاس روپے نصف جس کے پچیس روپے ہوتے ہیں بابت حق تصنیف وطباعت دائمی مسودہ کتاب "الصالحات" جو میرا تصنیف کردہ ہے فرم ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور سے وصول پائے۔ اقرار ہے کہ میں اس مسودہ کو نہ خود طبع کرونگا اور نہ کسی تاجر کتب یا پبلشر کو طبع کرنے کی اجازت دوں گا"۔ ۷۱

قاضی صاحب نے یہ تحریر ۱۹۴۷ء میں لکھی۔ اس وقت وہ اخبار "زمزم" لاہور کے مدیر تھے۔ بعد میں یہ کتاب ۱۹۸۷ء میں انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی مبارک پور کی طرف شائع ہوئی۔

(۱۷) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں

یہ بھی پینتیس صفحے کا ایک رسالہ ہے، یہ چار مرتبہ اشاعت پزیر ہوا۔ پہلی بار دائرۃ المصنفین مبارک پور سے ۱۹۶۹ء میں، دوسری مرتبہ ۱۹۸۵ء میں مکتبہ الحق جوگیشوری بمبئی، تیسری بار ۱۹۸۸ء میں شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند نے اور چوتھی مرتبہ ۲۰۰۵ء میں فرید بکڈپو نئی دہلی نے اسے بڑی آب وتاب سے طبع کیا۔

اس رسالے کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں عہد سلف کے مسلمانوں کی دعوتی تبلیغی اور تعلیمی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کا دوسرا ایڈیشن یعنی (جدید ایڈیشن) ایک سو تیس صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۸) اسلامی شادی

یہ رسالہ مولانا نے ان حالات میں لکھا جب کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء کا معاملہ انتہائی عروج پر تھا اور نکاح وطلاق اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں حکومت دخل انداز ہونا چاہتی تھی اور کچھ سفید پوش اسلام کے نمائندے بن کر اس سلسلے میں حکومت کی طرف داری کررہے تھے۔ان کا سب سے بڑا حربہ عورتوں کی مظلومیت تھی۔ ۱۸

مولانا نے اس کتاب میں نکاح کی ترغیب، ضرورت واہمیت ،اس کے شرائط، لڑکی کی رضامندی، صلاح ومشورہ، حق مہر اور دعوت ولیمہ وغیرہ سے متعلق تفصیلی معلومات احادیث وواقعات کی روشنی میں لکھ کر عورتوں کی بالادستی کو تمام لوگوں کے سامنے واضح کردیا تاکہ ہر مسلمان سلفِ صالحین کے اسوۂ عمل کے مطابق زندگی گذارنا سیکھیں۔

(۱۹) معارف القرآن

یہ بھی ایک رسالہ ۱۵ صفحے کا ہے۔ دراصل یہ رسالہ قاضی صاحب کے مستقل عنوان ''جواہر القرآن'' کا مجموعہ ہے۔ جو مولانا روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی مین لکھتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں ایجنسی تاج کمپنی بمبئی نے اسے شائع کیا تھا،اس کا نیا ایڈیشن کتب خانہ فیض ابرار انکلیشور، ضلع بھڑوچ گجرات سے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔ اب اس کی ضخامت ایک سو تینتالیس صفحات پر مبنی ہے۔

قاضی صاحب کی اس کتاب (معارف القرآن) پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''قاضی اطہر مبارک پوریؒ صاحب ایک کہنہ مشق صاحبِ قلم ہیں، بمبئی کے اخبارات وجرائد میں ان کے قلم سے دینی، اسلامی، اصلاحی عنوانات پر مضامین سالہا سال سے نکل رہے ہیں۔ یہ ان کے اس قسم کے مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر مضمون کا تعلق قرآن کی کسی نہ کسی آیت سے ہے۔ جلی عنوانات، توحید، رسالت، کتاب اور دینی زندگی نظر آئے۔ حالاتِ حاضرہ پر اشارے مصنف (قاضی) جابجا کرتے گئے ہیں جو اکثر صورتوں میں مفید اور پر لطف ہیں''۔ ۱۹

(۲۰) طبقات الحجاج

یہ کتاب ایک سو پچانوے (۱۹۵) صفحات پر محیط ہے۔ اسے ۱۹۵۸ء میں انجمن خدام النبی ابوصدیق مسافر خانہ بمبئی نے شائع کیا تھا۔ اس میں محدثین وعلماء کے حج سے متعلق سبق آموز واقعات درج ہیں اور دوسری مرتبہ فرید بکڈپو دہلی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا جو ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۱) علی وحسین

یہ کتاب تین سو چھتیس (۳۳۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں پاکستان کے ''محمود عباسی امروہوی'' کی فتنہ انگیز کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' کا جواب ہے۔ عباسی کی اس کتاب کا بہت سے لوگوں نے الگ الگ جواب لکھا، مگر قاضی اطہر مبارک پوری کا لکھا ہوا جواب بہت پسند کیا گیا۔

قاضی صاحب نے اس کتاب (خلافت معاویہ ویزید) کا جواب ممبئی سے نکلنے والے اخبار ''انقلاب'' میں لکھا جو ۷ نومبر سے ۱۷ دسمبر ۱۹۵۹ء تک ۳۵ قسطوں میں شائع ہوا ۱۹۶۰ء میں علی وحسین کے نام سے دائرہ ملیہ مبارک پور نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا، پاکستان سے یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کا جدید ایڈیشن اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے جو ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

قاضی صاحب اس کتاب میں محمود عباسی کی غلطیوں کی تردید کرتے ہوئے ان کی علمی خیانتوں پر زبردست گرفت کی ہے۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی، سابق ڈین شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈائرکٹر جامعہ ہمدرد نئی دہلی جو خود ایک قابل مقرر اور جانے مانے مصنف تھے۔ انھوں نے اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے:

> ''محمود عبّاسی کی کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' نے اگرچہ ہندو پاک کے مسلمانوں میں ایک ہیجان برپا کر دیا، لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے اہلِ علم حضرات نے اس کی رد میں علمی و سنجیدہ مضامین لکھے اور اس وجہ سے اصل مبحث کے متعلق اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا۔ قاضی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''علی و حسین'' میں ان تدلیسات و تلبیسات کا پردہ چاک کیا ہے۔ انھوں نے ابن تیمیہ، ابن خلدون

اور ابن کثیر وغیرہ کے ان ماخذوں سے بھی استدلال کیا ہے جن پر
عباسی صاحب کو بڑا بھروسہ تھا''۔ پھر مزید لکھتے ہیں کہ "اس کتاب
کے رد میں اب تک جتنی کتابیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں زیر
تذکرہ کتاب جامع اور معتدل نقطۂ نظر اور سنجیدہ تحقیق و زبان کی حامل
ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے''۔[۲۰]

(۲۲) حج کے بعد

یہ بھی چالیس صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ ۱۹۵۷ء میں انجمن خدام النبی بمبئی نے
شائع کیا تھا۔

اس میں قاضی اطہر صاحب کی وہ تقاریر شامل ہیں جو انھوں نے بحری جہاز میں
حاجیوں کے درمیان حج کے بعد ان کی ذمہ داری سے متعلق کی تھیں۔ اس کتاب کو دانش بکڈپو
ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر نے جون ۲۰۰۴ء میں اور فرید بکڈپو نئی دہلی نے ستمبر ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

(۲۳) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک

یہ کتاب قاضی صاحب کے حالاتِ زندگی کا پہلا حصّہ ہے، جس میں انھوں نے
اپنی پیدائش سے لے کر فراغتِ علمی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کو سب سے پہلے دائرہ ملیہ مبارک
پور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا تھا، پھر مکتبہ صوت القرآن دیو بند سے اس کا دوسرا ایڈیشن
شائع ہوا۔ مولانا کے حالاتِ زندگی سے طالب علموں کے اندر حصول علم کا ذوق پیدا ہوتا ہے
اور ان کی ذہنی ساخت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے سادہ اور سلیس زبان میں اپنی داستانِ
ناتمام کو قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز کی تحریر قابل ستائش ہے۔

موصوف فرماتے ہیں کہ "خود اعتمادی اور خود سازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی
تشجیع و تشویق اور ہمت افزائی کے لیے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن و دماغ لے کر دار العلوموں اور
جامعات کی لق ودق شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہ وہاں بہترین تعلیمی و تربیتی نظام کے
تحت لائق و فائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں مگر عام طور سے ان کو اپنے مقصد میں ناکام
ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے۔ ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے
مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدّ وجہد کرنی چاہیے''۔

آگے لکھتے ہیں کہ "میں نے اپنی طالب علمی کی کہانی خودستائی یا خودنمائی کے لیے

نہیں لکھی ہے بلکہ طلبہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں"۔[۲۱]

(۲۴) کاروانِ حیات

قاضی صاحب نے اس کتاب میں بھی اپنی زندگی کے حالات اور طالب علمی کے متعلق بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ "قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" کے بعد لوگوں کا اصرار بڑھا کہ اس پر کچھ اور لکھا جائے اس وجہ سے موصوف نے اپنے اشہب قلم کو دوبارہ حرکت دی اور کاروان حیات مرتب کرنا شروع کر دیا۔ ابھی یہ کارواں کچھ ہی دور چلا تھا کہ حیات مستعار کا سفر ہی ختم ہو گیا اور یہ داستانِ حیات نامکمل ہی رہ گئی، مگر پھر بھی جتنی ہے اتنی بہت ہے اور با اثر بھی۔

مولانا کی اس ادھوری سوانح کو ماہنامہ "ضیاء الاسلام" شیخوپور نے ۲۰۰۳ میں قاضی اطہر مبارک پوری نمبر صفحہ ۴۱ سے صفحہ ۱۳۶ تک شائع کیا اور دوبارہ فرید بک ڈپونئی دہلی نے دونوں کتابوں یعنی "قاعدہ بغدادی" اور کاروانِ حیات کو یکجا کر کے ۲۳۸ صفحات میں شائع کیا۔

(۲۵) مسلمانوں کے ہر طبقہ و ہر پیشہ میں علم اور علماء

یہ کتاب دوسو اٹھائیس (۲۲۸) صفحات پر مبنی ہے۔ ۱۹۹۸ء میں مولانا کی وفات کے بعد شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند نے اسے شائع کیا، اس میں قاضی صاحب نے تقریباً ہر پیشے کے علم و علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنی تحقیق و جستجو کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ علم خواہ دنیاوی ہو یا دینی کسی خاص طبقے کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ دور جاہلیت میں اس طرح کا طریقہ رائج تھا کہ کمزور طبقہ علم حاصل کرنے سے قاصر رہتا تھا۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں ۲۰ طبقوں کے علماء کا تذکرہ کیا ہے، جس میں چرواہے، کسان، دست کار، لکڑہارے، دھوبی، درزی، موچی، حلوائی، بڑھئی، آٹا پینے والے اور پارچہ باف وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس طرح کا تذکرہ کر کے مولانا نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ کوئی بھی پیشہ علم کے حصول میں مانع نہیں ہے۔ پھر حدیث رسولؐ کی روشنی میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے خود پارچہ بافی کے پیشے کی تعریف کی ہے اور اس پیشے کا قدیم ترین اور مشہور مرکز یمن ہے اور انصار مدینہ جو اصلاً اور نسلاً یمنی ہیں خود ان میں یہ پیشہ موجود تھا۔

قاضی صاحب کی یہ کتاب بھی ابتداء میں ایک مضمون کی شکل میں تھی جو ماہنامہ ''البلاغ''، بمبئی میں ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا، بعد میں اس مضمون کو وسعت دے کر کتابی شکل میں شائع کیا گیا، جو کافی مقبول و معروف ہوئی۔

(۲۶) علماءِ اسلام کی خونیں داستانیں

مورخِ اسلام قاضی اطہر مبارک پوری کی یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں پورہ رانی مبارک پور اعظم گڑھ سے دوسو اڑتالیس (۲۴۸) صفحات میں شائع ہوئی۔ جب کہ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں لکھی گئی تھی اور اس کی کتابت شدہ کاپیاں تقسیم ملک کے دوران ۱۹۴۷ء میں غائب ہو گئیں۔ بعد میں تلاش بسیار کے بعد کتاب کا کچھ حصہ سلمان مبشر صاحب کو مل گیا لہٰذا انھوں نے حفاظت کی نیت سے اسے شائع کرادیا۔

زیرِ تذکرہ کتاب میں احقاق حق اور ابطال باطل کی راہ میں پیش آنے والے واقعات اور پہلی صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری تک اسلامی تحریکوں، فتنوں اور علماء اسلام پر ہونے والے ظلم کی داستانیں شامل ہیں۔

اس کتاب میں قاضی صاحب نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ ہر صدی کی تحریک و واقعات کو الگ الگ ابواب کے تحت پیش کیا ہے۔ پہلے ہر صدی میں ہونے والے فتنوں کا اجمالی ذکر ہے، اس کے بعد علماء اسلام پر ہونے والے ظلم کی تفصیل۔ پہلی صدی ہجری کے باب میں حضرت خبابؓ، حضرت بلال حبشی، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت سمیہؓ، حضرت صہیب رومی، حضرت ذنیرہؓ، حضرت ام عبیسؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں۔

دوسری صدی میں بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے دورِ فتن کا ذکر ہے۔ ان کے ظلم و عدوان کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ ''اس دور میں علماء کو دڑے لگائے گئے۔ سربازار تشہیر کی گئی۔ کثیر تعداد میں علماء کو قتل کیا گیا اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں رکھا گیا۔ اس وقت خفیہ زہر دینے کا رواج بھی شروع ہوا۔ بنوامیہ کے دور میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو زہر دیا گیا، بنوعباسیہ میں امام ابوحنیفہؒ کو قید خانہ میں زہر دیا گیا، قتل سے پہلے ان کی زبان کاٹی گئی، لوہے کے گرم طشت پر سر رکھ کر جان لی گئی۔

دوسری صدی کے بعد تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے

بعد چھٹی صدی اور ساتویں صدی اور آٹھویں صدی کے علماء ومشائخ کا ذکر ہے۔ اس میں امام ابن تیمیہ حرانیؒ، امام ابن قیم، فقیہ ابوالعباس فارسیؒ، شیخ ظہیر الدین عمیمیؒ، شیخ شمس الدین کوئلیؒ، شیخ صلاح الدین درویشؒ، شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ وغیرہم کے علاوہ اور بھی مجاہد ملت کا تذکرہ ہے۔

اسی طرح دسویں صدی میں ان جابر وظالم بادشاہوں کے فتنوں کو بیان کیا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''اس صدی کا سب سے بڑا فتنہ اکبر کا ایجاد کردہ فتنہ ''دین الٰہی'' ہے۔ اکبر بادشاہ ۹۶۳ھ میں تخت پر بیٹھا اور ۹۸۰ھ میں اس نے ایک نئے دین کی ایجاد کی اور یہ فتنہ بنوعباسیہ کے فتنہ ''خلق قرآن'' کے مشابہ تھا''۔

علماء سوء نے اس کے دربار میں بیٹھ کر جنگ کی حلت وحرمت میں بھی اختلاف کیا جو ایک نئے دین کو ایجاد کرنے کا سبب بنا اور اس سے یہود وعیسائی اور ہندو وغیرہ کو اسلام کے خلاف زہر اگلنے کا موقع ملا۔

اس فتنہ وفساد کے بانی ومبانی میں ملا مبارک ناگوری، اس کے بیٹے ابوالفضل اور فیضی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی حیثیت وہی ہے جو ''مامون'' کے فتنہ ''خلق قرآن'' میں احمد بن ابی داؤد معتزلی اور اس کے ساتھیوں کی تھی۔ جاہل اکبر کو ان ملاؤں نے بہت ورغلایا۔ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں، انھوں نے حج کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا اور بادشاہ کو راضی کرکے مردوں کو طرح اپنے گھر میں سونے کی سلوں کو دفن کر کے مقبرہ بنایا اور آخر میں ذلت میں جان دی۔[۲۲]

گیارہویں صدی بھی ان تحریکات سے پر ہے۔ لیکن بارہویں صدی میں شیعیت، خانقاہی فساد وفتنہ پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف علماء حق کی تذلیل وتوہین ہو رہی تھی، قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ مذہبی تعصب اپنے عروج پر تھا اسی دور سیاست میں بریلویت، دیوبندیت، سنی، وہابی کی پیداوار ہوئی۔

اس کو ختم کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، سید احمد بلگرامی، ملا قطب الدین سہالوی، حضرت شاہ فخر الدین دہلوی، ملا نظام الدین جیسی اہم شخصیات پیدا ہوئیں اور اسی سلسلے میں یہ علماء وصلحاء ظالموں کے ظلم کا نشانہ بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ قاضی صاحب کی یہ تصنیف علماء کرام کے اہم واقعات، جابر

بادشاہوں، ضمیر فروش پیشواؤں، درندہ صفت انسانوں اور جاہل عوام کے ناروا سلوک اور سفاکیوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں مولانا نے معتبر و مستند کتابوں کی مدد لی ہے۔ جس میں اخبار الخیار، طبقات ابن سعد، مروج الذہب، تاریخ ابن عساکر، تذکرۃ الحفاظ، کشف الظنون، مآثر الکرام وغیرہ شامل ہیں۔

(۲۷) آسودگانِ خاک

زیر تذکرہ کتاب ''آسودگانِ خاک'' ان تعزیتی شذرات و مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ ''البلاغ''، ممبئی، روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی، روزنامہ ''جمہوریت''، ممبئی اور اخبار ''انصار''، بہرائچ میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن فرزندِ قاضی اطہر سلمان مبشر صاحب نے اسے ۲۰۰۹ء میں القاضی کمپیوٹر مبارک پور ضلع اعظم گڑھ سے کتابی شکل میں شائع کرایا ہے۔ اس کی ضخامت تین سو اکیس (۳۲۱) صفحات پر مبنی ہے۔

اس میں ایک سو اسّی (۱۸۰) سے زائد ان علمی شخصیات کا تذکرہ ہے، جو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں اور ان میں ہند و بیرونِ ہند کے علماء، فضلاء، ادباء، شعراء، خطباء اور اہل اللہ و ارباب علم و دانش کے علمی کارناموں کا بھی مجملاً و مفصلاً ذکر ہے۔

ان ارباب اہل علم میں سے تقریباً پچاس سے زائد شخصیات ایسی ہیں جن سے قاضی صاحب کے ذاتی تعلقات تھے۔ اس لیے ان کا ذکر زیادہ تفصیل سے ہے، کیونکہ ان کے حالات و علمی کمالات کا علم حاصل کرنے میں زیادہ سہولت ہوئی۔ ان حضرات کے ناموں میں چند کے نام درج ذیل ہیں:

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند)، مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم حکومتِ ہند)، مولانا قاری محمد طیب (مہتمم دار العلوم دیوبند)، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (ناظم جمعیۃ علماءِ ہند)، مولانا ابوالوفاء افغانی (صدر لجنۃ احیاء المعارف العثمانیہ حیدر آباد، محدّث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (امیر الہند)، مولانا محمد عثمان فارقلیط (ایڈیٹر روزنامہ اخبار الجمعیۃ دہلی)، مولانا عبدالعزیز راجکوٹی، شاہ معین الدین ندوی (ایڈیٹر معارف، دار المصنفین اعظم گڑھ)، مولانا عبدالماجد دریا آبادی (ایڈیٹر صدق جدید لکھنؤ)، سید علوی مالکی (سعودی عرب)، الشیخ عبداللہ رمزی مکی (سعودی عرب)، ڈاکٹر عبدالمنعم (وزیر اوقاف قاہرہ مصر)، وغیرہ وغیرہ۔

دراصل ان حضرات کی زندگی علم وعمل، جہد پیہم اور عزم مصمم سے عبارت تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ حضرات اپنے وقت کے اساطینِ علم اور اپنے ہم عصروں میں رجال فن شمار کیے جاتے تھے۔ درحقیقت یہ قوم وملّت کی آبرو اور اپنے علم وعمل کے اعتبار سے جہاد بالقلم تھے۔

قاضی صاحب نے ان شخصیات کے علمی ودینی کارناموں کو جمع کر کے علمی گوشے میں زبردست اضافہ کیا ہے۔ جولوگ ان حضرات سے ناواقف ہیں وہ ضرور اس کتاب کے مطالعے سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ بھی۔

(۲۸) العقد الثمین (عربی)

اس کتاب کا پورا نام ''العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین'' ہے۔ اس میں اسلامی ہند کی فتوحات اور ہندوستان میں تشریف لانے والے صحابہ وتابعین کے حالات کو مفصّل بیان کیا گیا ہے اس کے علاوہ تاریخ وسیر ومغازی کے حالات، احادیث رسولؐ اور ان رجال کا تذکرہ کر کے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان کی فتح اور صحابہ وتابعین کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ مولانا قاضی صاحب نے اسے ایک ہی سال میں بڑی جدوجہد اور محنتِ شاقہ سے مکمل کیا۔

اس کتاب کی اشاعت اوّل ۱۹۶۸ء میں ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی بمبئی سے ہوئی جو تین سو پینتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اور اشاعتِ ثانی دار الانصار قاہرہ، مصر سے ۱۹۷۹ء میں ہوئی تو اس کی ضخامت دو سو اکتیس صفحات ہوگئی۔

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ بے مثال مصنف اور مفکر اسلام عبداللہ السمان کے انٹرویو سے لگایا جائے جسے سعودیہ عربیہ کے اخبار الدعوۃ نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا۔

مولانا عبداللہ السمان سے سوال کیا گیا کہ چھ سالہ جیل سے رہائی کے بعد آپ عہد اسلامی کی ابتدائی فتوحات کی تاریخ وتحقیق پر اتنا زور دے رہے ہیں اس کے کیا اسباب ہیں اور آپ کے ذہن میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا۔ جب کہ آپ نے اس سے قبل اس پہلو پر کبھی اظہار خیال نہیں فرمایا تھا۔

انھوں نے جواب دیا کہ جس چیز نے میرے ذہن میں یہ قضیہ پیدا کیا وہ ''العقد

الثمین فی فتوح الھند ومن ورد فیھا من الصّحابہ والتّابعین" ہے۔
اب تک ہندوستان میں عہد اول کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ سرسری اور ضمنی حیثیت سے لکھی گئی، مشہور مؤرخ مدائنی، متوفی ۲۲۵ھ نے ہندوستان کے عہد اول کی تاریخ میں تین کتابیں لکھیں۔ واقدی متوفی ۲۰۷ھ نے بھی اخبار فتوح السند لکھی لیکن ان کی حیثیت اسلام کی عالمی تاریخ کے ایک جزء کی ہے، اس میں تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ یعنی پوری تحقیق نہیں کی گئی ہے، جو اس کتاب العقد الثمین میں موجود ہے۔ پھر مزید لکھتے ہیں کہ:

> "ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کے عہدِ اول کی تاریخ اس ملک کے اہل علم کے قلم سے ہو۔ اگر پوری دنیا میں اسلام کے ابتدائی نفوذ کی تاریخ اسی طرح لکھی جائے جیسے العقد الثمین میں ہے تو اسلام کی نئی نسل میں احیاء اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا"۔ ۲۳

(۲۹) جواہر الاصول (عربی)

اس کتاب کا پورا نام "جواہر الاصول فی علم حدیث الرسولؐ" ہے اس کے مصنف ابوالفیض محمد بن علی حنفی فارسی ہیں۔ مگر ان کی یہ کتاب غیر مطبوعہ تھی۔

قاضی صاحب نے اس کتاب کی تحقیق وتصحیح کر کے مقدمہ لکھا، ۱۹۷۳ء میں شرف الدین الکتبی واولادہ بمبئی نے ایک سو ساٹھ صفحات میں اسے شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن "الدار السلفیہ" نے بمبئی سے شائع کیا اور مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے بھی اس کا ایڈیشن شائع کر کے حجاز میں عام کیا۔ مولانا کی یہ کتاب بھی اہل علم کے حلقوں میں بڑی مقبول ہوئی۔

اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں کہ "حدیث نبویؐ کے ضخیم دفتروں سے قطع نظر خود اصول حدیث کا ایک مستقل فن ہے اور اس کے ماہرین فن نے تصنیفات کا انبار لگا دیا ہے اور ان میں ایک ممتاز لکھنے والے متأخرین میں ابوالفیض محمد بن محمد علی فارسی ہیں خوشی کی چیز یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان کے ایک فاضل قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے ان (ابوالفیض) کی کتاب جواہر الاصول کا قلمی نسخہ کہیں سے ڈھونڈ نکالا اور پھر تصحیح ومقابلہ کے بعد اس کو شائع کرایا، یہ کتاب مستند اور بلند پایہ ہے اور طبقۂ فن کے ہر طرح کے کام کی ہے۔ ۲۴

مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ دار العلوم دیوبند، اس کتاب پر اظہار خیال کرتے

ہوئے فرماتے ہیں ''زیر تذکرہ کتاب شیخ علی فارسی کا علم حدیث پر منضبط اور جامع رسالہ ہے جس پر مشہور اہلِ علم قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے تعلیقات قائم کی ہیں اور مختلف مراجع سامنے رکھ کر مضامین کی تشریح وشواہد پیش کیے ہیں۔اس کتاب کی عربی اتنی رواں دواں ہے کہ اسے تمام مدارسِ عربیہ میں داخل نصاب کیا جاسکتا ہے۔[۲۵]

(۳۰) تاریخ اسماء الثقات

قاضی صاحب کی یہ تصنیف بھی عربی میں ہے۔دراصل یہ ابن شاہین بغدادی کی تصنیف ہے۔یہ ایک قلمی غیر مطبوعہ نسخہ تھا، جو ۱۱۳۷ھ کا لکھا ہوا تھا اور وہ بمبئی کی جامع مسجد کے کتب خانہ ''محمدیہ'' میں موجود تھا۔قاضی صاحب نے اسے نقل کرلیا پھر اس کی تحقیق وتصحیح کر کے اس پر تعلیقات لکھیں ۱۹۸۶ء میں ۲۳۵ صفحات میں شرف الدین الکتبی واولادہ نے اسے شائع کیا۔

(۳۱) الطباعۃ عند العرب: (عربی)

اس موضوع پر مولانا نے کافی مواد جمع کرلیا تھا، مگر دیگر مصروفیات نے اس کام کی اجازت نہیں دی اس لیے جو کچھ لکھا تھا اسے (حکیم عبدالحمید دہلوی، مالک ہمدرد دواخانہ دہلی) کی تالیف ''نذر حمید'' میں شائع کرادیا، جو صفحہ ۴۳۹ سے صفحہ ۴۵۱ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۳۲) علماء اسلام کے القاب وخطابات تاریخ کی روشنی میں

اس موضوع پر قاضی صاحب نے مضمون لکھا جو ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ البلاغ بمبئی میں ۲۲ صفحات میں شائع ہوا۔اس میں اہل علم وفضل کے لیے استعمال کیے جانے والے القاب و خطابات موجود ہیں۔جیسے عالم، قاری، منشی، معلم، علامہ، مکتب، مودب، ملاّ، مولانا وغیرہ وغیرہ۔

اس کی تکمیل میں حدیث وسیر اور تاریخ وتذکرہ کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے ۲۰۰۴ء میں فرید بک ڈپو نے اسے شائع کیا۔اس رسالے نے بھی کافی شہرت پائی۔

(۳۳) مراۃ العلم: (عربی)

یہ ایک عربی رسالہ ہے جسے قاضی صاحب نے طالب علمی کے دور میں لکھا اور ۱۹۴۳ء میں احیاء العلوم اسلامیہ کی مجلسِ ادارت کے تحت شائع کرایا، اس میں علماء سلف کے واقعات اور ان کے حالات زندگی کو قلمبند کیا گیا ہے۔

(۳۴) مکتوبات امام احمد بن حنبلؒ

یہ رسالہ مکتبہ الفہیم مؤناتھ بھنجن سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں اڑتالیس صفحات ہیں۔ زیر تذکرہ رسالہ کے مضامین ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ بعد میں ان تمام مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل دی گئی۔ یہ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود دلچسپی سے بھرپور ہے۔

اس میں امام احمد بن حنبلؒ کے حالات زندگی اور ان آزمائشوں اور مصائب کا تذکرہ ہے، جو انھیں خلیفہ مامون کے عہد میں پیش آئیں۔ مامون نے خلافت کا عہدہ سنبھالتے ہی مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ ظاہر کیا اور امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ دین کو اس بات پر مجبور کیا کہ اس ''مسئلہ خلق قرآن'' کی تصدیق کریں۔ انکار کی صورت میں وہ علماء دین کو اذیتیں دیتا تھا اور قید و بند کی مشقتوں میں ڈالتا۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''خلیفہ مامون نے ''مسئلہ خلقِ قرآن'' کا فتنہ امارت حاصل کرنے کے بعد ہی ظاہر کیا مگر اس فتنہ کو فروغ اس کی وفات کے بعد ہوا۔ یعنی خلیفہ معتصم کے عہد میں''۔[۲۶]

اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل نے تمام اذیتیں برداشت کیں اور اسلامی عقائد پر مضبوطی سے قائم رہ کر دلائلِ قرآن سے یہ ثابت کر دیا کہ قرآن صرف اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں۔ لکھتے ہیں:

آیت: ''وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ''

ترجمہ: (اگر کوئی مشرک تم سے پناہ چاہے تو پناہ دے دو۔ تا کہ کلام اللہ سن لے)[۲۷]

اور ان کے چند مکتوبات اس میں شامل ہیں جو محدث جلیل مسدد بن سرہدؒ، خلیفہ متوکل، عبیداللہ بن یحییٰ بن خاقان، اسحاق بن حسان، سعید بن یعقوب، صالح بن امام احمد کے نام سے ہے اس میں ان ہی حضرات کے لکھے ہوئے خطوط کے جواب ہیں۔

خلیفہ متوکل نے امام احمد بن حنبلؒ سے قرآن کے متعلق سوال کیا تو امام صاحب نے مختلف عناوین سے ان کے سوال کا جواب لکھا۔

وہ جواب اس طرح ہے۔ قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے، دین میں جھگڑے سے بچنا اور سنت پر عمل کرنا، قرآن غیر مخلوق ہے، باریکیوں میں نہ پڑنا، بلکہ کتاب وسنت کی اتباع کرنا، نیکی پر ثابت قدم رہنا وغیرہ۔ غرضیکہ ان کے تمام مکتوبات عقائد اسلامی اور وعظ و نصیحت سے لبریز ہیں۔

چند اہم تصانیف کا تفصیلی جائزہ

(۳۵) عرب و ہند عہدِ رسالت میں

یہ کتاب ۱۹۶۴ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی اور اس کا جدید ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں فرید بکڈ پو دہلی سے شائع ہوا۔

قاضی صاحب کی یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے نادر معلومات کا گنجینہ ہے حالانکہ اس سے قبل مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس موضوع پر اپنی تصنیف ''عرب و ہند کے تعلقات'' میں اپنی مؤرخانہ بصیرت کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہے اور بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ پھر بھی ایک حد تک اس موضوع پر اضافے کی ضرورت تھی، لہٰذا قاضی صاحب نے اپنی جہدِ مسلسل اور نئے ماخذوں و معتبر حوالوں سے اس تشنگی کو ختم کیا۔

اگرچہ بعض واقعات کو قاضی صاحب نے بھی تشنہ چھوڑ دیا ہے جیسا کہ صفحہ نمبر ۱۲۸ پر کعبہ سے عقیدت کے بارے میں سندھی راجہ کے مسلمان ہونے کا ذکر کر کے اس کے سونے کا مرصع بت اور تخت کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ اس نے دونوں چیزیں خانۂ کعبہ کی نذر کر دی تھیں، مگر اس راجہ کا نام اور سن عیسوی یا ہجری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ خاص بات اس چیز سے خالی ہے۔ اس لیے اس جگہ ذہن مطمئن نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح کے دو ایک واقعات اور ہیں۔

اس تذکرہ کا مقصد نہ تو تنقید ہے اور نہ کمیاں نکالنا ہے بس یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر انسان اپنے بشری تقاضے کے تحت مکمل نہیں ہے۔

زیر تذکرہ کتاب میں قاضی صاحب نے خاص زمانۂ نبوت کے عرب و ہند سے بحث کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی آمد کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے، انھوں نے کتاب کو آٹھ بڑے ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب مختلف عنوانات پر مشتمل ہے۔

ابتداء میں انھوں نے ''عرب و ہند عہدِ رسالت میں'' کے عنوان سے پوری کتاب کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''نبی کی بعثت کے وقت عرب میں غیر ملکیوں کی آبادی تھی ان غیر

ملکیوں میں، رومی، فساسنہ، منازرہ، اساورہ اور ایرانی وزیج کو کثیر تعداد موجود تھیں اور اپنا اثر و اقتدار بھی برقرار کیے ہوئے تھیں۔ اگرچہ ہندوستانی قومیں بھی عرب میں موجود تھیں مگر ایرانی قومیں زیادہ غالب تھیں اور ہندوستانی قوموں کو ایرانیوں کے توسط سے ہی اقتدار نصیب ہوا پھر دھیرے دھیرے ہندوستانی قومیں عرب میں ہندوستانی اشیاء کی خرید و فروخت اور جہازوں و کشتیوں پر ملازمت کی وجہ سے وہاں حاوی ہوگئیں جس کی وجہ سے عرب ان کو مختلف ناموں سے پکارنے لگے، جیسے زط، اساورہ، سیابجہ، احامرہ، سیابچہ، بیاسرہ اور تکاکرہ وغیرہ پھر جب اسلام پھیلا تو عربوں کی طرح ہندوستانیوں نے بھی اسلام قبول کیا اور کچھ نے جزیہ دے کر رہنا پسند کیا''۔۲۸

تمہیدی بحث کے بعد کتاب کا آغاز ''نارجیل سے نخیل تک'' کے عنوان سے ہوتا ہے۔ پہلے یہ ایک مقالے کی شکل میں ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ کی چار قسطوں میں شائع ہوا تھا بعد میں اسے کتاب کا ایک باب بنا دیا گیا، اس میں تین عنوانات ہیں۔(۱) سندھ اور ہند عربوں کی نظر میں۔(۲) ہندوستان اور عرب کے درمیان بحری اور ساحلی راستے۔(۳) سواحل عرب کے قدیم بحری اور بری راستے۔ان تینوں عنوانات میں مولانا نے قدیم جغرافیائی راستوں کا ذکر کیا ہے۔جس میں بحری اور بری دونوں طرح کے راستے شامل ہیں۔

دوسرا باب عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات پر ہے اس میں درج عناوین یہ ہیں:

(۱) ہندوستان کے کس مقام سے کیا چیز عرب میں جاتی تھی؟

(۲) عرب میں ہندوستانی مال کی چار ساحلی منڈیاں: ابلہ، صحار، عدن، جار۔

(۳) اندرون عرب کا سب سے اہم تجارتی مرکز مکہ مکرمہ۔

(۴) عرب کے خاص خاص مقامات سے منسوب ہندوستانی اشیاء۔

(۵) عرب کے بڑے بڑے موسمی اور مقامی بازار۔

(۶) عربی ادبیات میں ہندوستان کی اشیاء کا ذکر۔

عرب میں ہندوستانی مال کی چار ساحلی منڈیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ ان منڈیوں میں صندل، کافور، باخور، قرنفل، کبابہ، نارجیل، نباتاتی کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے، ہاتھی، بانس اور بید کی لکڑیاں بھی فروخت ہوتی تھیں۔

ابلہ منڈی کے بارے میں خبر دیتے ہیں کہ یہ وہی منڈی ہے جسے حضرت غزوانؓ نے ۱۴ھ میں فتح کیا تھا اور اسی دوران اس کی تجارتی مرکزیت کی اہمیت کی وجہ سے بعض صحابہؓ نے وہاں (ابلہ) تجارتی کاروبار شروع کر دیا، جس کی وجہ سے یہ مقام اور مشہور ہو گیا۔

اس میں عرب کے بڑے بڑے موسمی و مقامی بازاروں دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبا، شجرہ، مہرہ، صنعاء، رابیہ، عکاظ، ذوالمجاز وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ شہر مرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ بازار اس پہاڑ کے درمیان لگتا تھا جس پر ہودؑ کی قبر ہے اور دبا کے بڑی اور بحری تاجر اٹھ کر یہاں آتے جاتے ہیں"۲۹ مگر اس کا بھی انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

زیر تذکرہ کتاب کا تیسرا باب "عرب میں آباد ہندوستانی قوموں" کے عنوان سے ہے۔ اس میں سب سے پہلے سندھ اور سندھی قوموں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ سندھ میں ایک قسم کا کپڑا بنتا تھا جسے "ثوب السندی" کہا جاتا تھا۔

علاوہ ازیں اس باب میں اور بھی کئی عناوین ہیں جیسے: (۱) ہند اور سندھ کی سات قومیں۔ (۲) ہندوستان میں جاٹوں کا علاقہ ایران اور عرب میں جاٹوں کا علاقہ۔ (۳) جاٹوں کے اثرات عربی زندگی میں۔ (۴) جاٹوں کی زبان اور اس کا اثر عربی زبان پر۔ (۵) جاٹوں اور عربوں کی باہمی معاشرت۔ (۶) جاٹوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزش سے کنارہ کشی۔ (۷) مسلمانوں کی خانہ جنگی کی طرف داری۔ (۸) جاٹوں کی سرکشی اور غارت گری وغیرہ۔

مولانا نے قدیم جغرافیہ نویس ابنِ خرداذبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مکران اور منصورہ (سندھ) کے درمیان کئی سو میل تک جاٹوں کا علاقہ ہے۔ ان کی رنگت و ہیئت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ سیاہ رنگ کی جنگ جو قوم ہے، جو عرب کے مختلف علاقوں میں آباد تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ بھی زوطی یعنی جاٹ تھے۔۳۰ کیونکہ کابل میں جاٹوں کی بہت زیادہ آبادی تھی اور امام اعظمؒ اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ قاضی صاحب نے الادب المفرد امام بخاری ص ۲۷ مطبع تازیہ مصر کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"مدینہ منورہ میں بھی قدیم زمانے سے کچھ جاٹ موجود تھے، جن میں سے ایک مسلمان جاٹ طبیب اور معالج تھا، جس نے حضرت عائشہؓ کے متعلق بتایا تھا کہ ان پر ان کی باندی نے سحر کر دیا تھا۔"[۳۴]

جاٹوں کے بارے میں مزید خبر دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جاٹوں نے نہ صرف یہ کہ عرب میں اپنی زندگی گذاری بلکہ ان لوگوں نے عربوں کو اپنے رہن سہن، زبان، بیان، عادات و اطوار سے بھی متاثر کیا اور خلافت راشدہ کے زمانے تک اپنی مادری زبان (ہندی) کو برقرار رکھا اور اسی (زبان) میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ جاٹوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کا بھی اقرار کیا ہے۔ یہ عربوں کے باہمی معاشرت اجتماعی معاملات وغیرہ میں بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔

اسی باب کے بعض عناوین یہ ہیں۔ مسلمانوں کی خانہ جنگی میں جاٹوں کی طرف داری۔ جاٹوں کی سرکشی اور غارت گری، میدیعنی بحری ڈاکو، میدکی تحقیق ہندوستان میں میدکا علاقہ، میدکی شرارت اور مسلمانوں کی تادیب، سیابجہ یا سیاو بچہ، سیابجہ کی تحقیق، سیابجہ عرب اور ایران میں، سیابجہ ایرانی فوج میں، سیابجہ عربی معاشرہ میں، سیابجہ کا بے رحمانہ قتل وغیرہ، احامرہ، احامرہ کی تحقیق، اساورہ ایرانی فوج میں، عہد فاروقی میں اساورہ کا اسلام لانا، عرب میں اساورہ کے علاقے، یمن کے ابناء اساورہ کی اولاد ہیں، عرب میں اساورہ کا اقتدار، اساوری رجال علم وفن عربی شاعری میں اساورہ کا ذکر، بیاسرہ، بیاسرہ کی تحقیق، سواحل ہند کے دس ہزار بیاسرہ، بعض بیسری علماء، تکاکرہ، محمد بن قاسم سے ٹھاکروں کی جنگ، عربی شاعری میں تکاکرہ وغیرہ کا ذکر شامل ہے۔ اس تیسرے باب کی فہرست عناوین کافی طویل ہے۔ لیکن دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس میں بہت سی نادر و نایاب باتیں موجود ہیں۔

کتاب کا چوتھا باب "عرب میں آباد ہندوستانیوں کی بستیاں" کے عنوان سے ہے۔ اس میں ذکر کیا گیا ہے کہ "عرب کے بالمقابل ہندوستان زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا اور عربی زندگی کے لحاظ سے یہاں کی زندگی زیادہ رنگین و دلفریب تھی، مگر پھر بھی ہندوستان میں کسی قدیم عرب آبادی کا پتہ نہیں چلتا، بس ایسا لگتا ہے کہ عرب تجارتی مقصد سے ہندوستان آتے تھے اور مقصد پورا ہونے پر واپس چلے جاتے تھے، اس کے برعکس ہندوستانی باشندے عرب میں جا کر مستقل طور پر آباد ہو گئے اور انھوں نے اپنی وطنیت و قومیت چھوڑ کر عربوں کی

طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ وہ عرب کے مشرق وجنوبی سواحل میں آباد تھے۔
اس کے علاوہ ہندوستانی قومیں یمن، عراق، بحرین اور عمان میں بھی آباد تھیں اور
یہاں کی مستقل رہائش سے ان کی زبان و زندگی بھی متاثر ہوئی تھی۔ نبی اکرمؐ کے وصال کے
بعد جب فتنہ ارتداد اٹھا تو اس میں بھی کثرت سے ہندوستانی قوموں کو شامل کیا گیا۔
خاص طور سے وہ ہندوستانی قومیں جو ایمان نہ لانے والی قوموں میں شامل تھیں، جن میں
جاٹ، سیابجہ وغیرہ زیادہ تھے۔
اس باب میں اور بھی دیگر عنوانات ہیں، جو عرب میں آباد ہندوستانیوں کا پتہ دیتے
ہیں، مثلاً قلب عرب میں نجران، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور تبوک کے اطراف وغیرہ ہیں۔
پانچواں باب ''عرب میں آباد ہندوستانیوں کو دعوت اسلام'' کے عنوان سے
ہے جو کافی دلچسپ ہے، مگر افسوس کہ قاضی صاحب جیسے محقق کو بھی اس کی تفصیل نہیں مل
سکی۔ بہر حال جو کچھ ملا انھوں نے بڑے مؤثر اور اچھے پیرائے میں اسے بیان کر دیا ہے۔
لکھتے ہیں کہ:

> ''زمانہ قدیم سے عرب میں ہندوستان کے لوگ آباد تھے اور عہد رسالت میں جب اسلام کی دعوت عام ہوئی اور اطراف وجوانب میں پھیلی تو عربوں کی طرح غیر عربوں میں بھی اس کی تبلیغ ہوئی اور ایرانیوں، رومیوں، حبشیوں کی طرح ہندوستانیوں کو بھی اس نعمت سے حصہ ملا اور یمن، بحرین، نجد وغیرہ میں رہنے والے ہندوستانی باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا، مگر اس کی تصریح وتفصیل کتب و تواریخ وسیر اور احادیث میں نہیں ملتی، مگر جستہ جستہ واقعات اور اشارات سے اس کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ہندوستانیوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے دعوت اسلام پر لبیک نہیں کہا بلکہ وہ یہود و نصاریٰ اور مجوس کی طرح اپنے آبائی دین پر قائم رہے اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ کیا گیا''۔[۳۴]

اس کے بعد قاضی صاحب نے جاہلی عربوں اور ہندوستانیوں میں تجارتی
تعلقات اور ان کے مذہبی واعتقادی تعلقات کی وسعت کو بیان کیا ہے۔ جسے ''جاہلی عربوں

اور ہندوؤں میں مذہبی ہم آہنگی'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

پھر سبع ہیکل کے بارے بتاتے ہیں کہ دنیا کی بت پرست قوموں کے ساتھ بڑے بت خانے تھے جو سبع سیارہ کے نام سے موسوم تھے سات بت خانوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) مکہ میں کعبہ زحل ستارہ کا ہیکل (۲) اصفہان میں مجوس کا آتشکدہ (۳) ہندوستان میں سومنات کا مندر (۴) بلخ میں نوبہار (۵) صنعاء یمن میں زہرا ستارہ کے نام کا بیت غمدان (۶) فرغانہ میں آفتاب کا ہیکل (۷) چین کا ہیکل۔

خانۂ کعبہ کے غلط عقیدہ کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ کچھ لوگوں کا یہ غلط عقیدہ تھا کہ خانۂ کعبہ زحل ستارہ کے نام پر بنایا گیا ہے اسی لیے اس میں دوام وبقا کی شان پائی جاتی ہے (نعوذ باللہ)

اسی باب کا ایک عنوان ''کعبہ سے عقیدت'' ہے۔ جس میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں تبت اور سندھ کے علاقہ کا ایک راجہ مسلمان ہوا۔ اس کے پاس انسانی شکل کا سونے کا ایک مرصع بت اور اس کا تخت تھا۔ اس راجہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ دونوں چیزیں خانۂ کعبہ کی نذر کر دیں۔۳۳

پانچویں باب میں بھی بہت سے عناوین ہیں جن کی تفصیل نہ بیان کرتے ہوئے صرف ذکر کیا جا رہا ہے۔ (۱) قلیس سے عقیدت۔ (۲) عرب اور ہندوستان کے مشہور بت اور بت خانے اور ان کی مشترک باتیں۔ (۳) عرب کے تمام ہندو صائبہ اور کچھ مجوس۔ (۴) عرب کے ہندو اور دعوتِ اسلام۔ (۵) یمن میں دعوتِ اسلام اور وہاں کے ہندوستانی۔ (۶) حضرت باذان حاکم یمن۔ (۷) حضرت بیرزن ہندی یمنی۔ (۸) نجران میں دعوت اسلام اور وہاں کے ہندوستانی وغیرہ وغیرہ۔

چھٹا باب ''پیغمبر اسلام اور ہندوستان کے باشندے'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں کئی عنوانات ہیں اور ہر عنوان اپنے اندر قیمتی معلومات کا خزانہ سموئے ہوئے ہے۔

''ہندوستان میں جہاد کرنے کی فضیلت و بشارت'' کے عنوان میں یہ لکھا ہے کہ عہدِ رسالت میں ہندوستان جانا پہچانا ملک تھا، بلکہ اس کے متعلق حضرت آدمؑ کی وجہ سے احترام کا جذبہ پایا جاتا تھا اور اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے ہندوستان میں جہاد کرنے کی پیشین گوئی فرماتے ہوئے اس میں شریک ہونے والوں کو نار جہنم سے مامون و محفوظ ہونے

متعلق ایک حدیث بھی مروی ہے۔ ہندوستان میں جہاد کرنے سے
کی بشارت دی ہے۔ ''حضرت ثوبانؓ مولیٰ رسولؐ سے مروی ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے۔ ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم کا ساتھ دے گا''۔ ۳۴

چھٹے باب کے عناوین ذیل میں اس طرح ہیں:

(۱) ہندوستانیوں اور ہندوستانی چیزوں سے واقفیت۔
(۲) ہندوستان کے باشندوں کی اسلام اور پیغمبر اسلام سے واقفیت۔
(۳) سراندیپ کا وفد۔
(۴) ہندوستانی راجہ کا ہدیہ زنجبیل۔
(۵) سرباتک راجہ قنوج اور رتن ہندی کی حقیقت۔

سراندیپ کے وفد سے متعلق قاضی صاحب نے ''عجائب الہند'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب نبیؐ کے ظہور کی خبر اہلِ سراندیپ کو ہوئی تو انھوں نے اپنا ایک آدمی مدینہ منورہ بھیجا مگر بدقسمتی سے وہ آدمی راستے میں فوت ہوگیا، صرف اس کا نوکر وہاں تک پہونچا، اس وقت نبیؐ کا وصال ہو چکا تھا اور حضرت ابوبکرؓ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ اس وقت خلیفہ تھے، اس نے حضرت عمرؓ کے واقعات سراندیپ جا کر لوگوں کو سنائے جس سے اہلِ سراندیپ کافی متاثر ہوئے۔

لیکن ان (اہل سراندیپ) کے مسلمان ہونے کی خبر نہیں ملتی ہے۔ درج بالا تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے سراندیپ والوں کو نبیؐ کی بعثت کی خبر دیر سے پہنچی، کیونکہ یہ کافی پچھڑے ہوئے لوگ تھے، ان کے رہن سہن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ سنیاسی تھے۔

قاضی صاحب اہل سراندیپ کے رہن سہن کے متعلق بتاتے ہیں کہ ''یہ لوگ عموماً ننگے رہتے تھے۔ صرف آگے پیچھے معمولی سا کپڑا باندھ لیتے تھے اور جاڑے میں بدن پر چٹائی لپیٹ لیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ رنگ برنگ کے کپڑوں کی دھوتی پہنتے تھے۔ سر اور داڑھی کے بال نہیں رکھتے تھے، مُردوں کی کھوپڑی میں کھانا کھاتے تھے تا کہ دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہو''۔ ۳۵

ساتواں باب ''عہد رسالت میں ہندوستانی اشیاء کا استعمال'' کے عنوان سے

ہے۔اس میں ہندوستان کی ان چیزوں کا تذکرہ کیا ہے، جو عرب ممالک میں جایا کرتی تھیں اس کے نام درج ذیل ہیں۔

لغوی اور لسانی توارد، کافور، مشک اور زنجبیل، لونگ، مشک اور عود کا ہار، کست ہندی، ساگوان، ہندی نیزے، ہندی تلوار، سندھی کپڑے، کرتہ، سندھی مرغی، ہندی طرز کی موتراشی، *شطرنج، نرد، گودھنا، پچھتر وغیرہ۔

درج بالا تمام چیزیں جو ہندوستان سے جاتی تھیں اور عرب انھیں بڑے شوق سے استعمال کرتے تھے۔ مشک کو خود نبی کریمؐ نے استعمال کیا ہے اور آپؐ اسے بہت پسند کرتے تھے۔

زیرتذکرہ کتاب کا آٹھواں باب اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے عنوان سے ہے اس میں دس ذیلی عناوین ہیں۔

عہدِ رسالت میں بحری اسفار، عہدِ رسالت میں دعوتِ اسلام کی دو روایات، وصال نبویؐ کے چوتھے سال ہندوستان میں صحابہ کرامؓ کی تشریف آوری، ۱۵ھ میں تھانہ بھڑوچ اور دیبل پر حملہ، عام تاریخوں میں ان حملوں کے بیان نہ کرنے کی وجہ یا حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفیؓ، حضرت حکم بن ابی العاص ثقفیؓ، حضرت مغیرہ بن ابی العاصؓ، حضرت حفص بن ابی العاصؓ، خلافتِ راشدہ میں ہندوستان سے تعلقات وغیرہ۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے اپنی مؤرخانہ ذہنیت اور وسعت مطالعہ وحسنِ انتخاب کے ذریعے اس کتاب کو انتہائی قیمتی کتاب بنادیا ہے۔اس میں انھوں نے عربوں کے باہمی روابط وتعلقات کو نہایت تفصیل سے پیش کرکے مفید واہم معلومات بہم پہنچائی ہے۔

قاضی صاحب نے لفظ ''بابو'' کی تشریح اس طرح کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''عرب میں بابوس اونٹنی کے بچّے کو کہتے ہیں۔لیکن ہندوستان میں انسان کے چھوٹے بچے کو بابو کہا جاتا ہے، بابو اور بابوس میں صرف لفظ ''سین'' کا فرق ہے اور عرب میں بچہ باپ کو اور باپ بچہ کو بابا کہتا ہے۔

انھوں نے دونوں ملکوں (عرب اور ہند) کے سیاسی وثقافتی معاشی ومعاشرتی تعلقات کو بیان کرکے اپنی تلاش وتحقیق کا کھلا ہوا ثبوت پیش کیا ہے۔ قاضی صاحب نے اہم کتابوں سے اخذ واقتباس کرکے اہل علم کو نایاب تحفہ دیا ہے۔ اس کتاب کے مراجع و

مصادر سے ان کی محنت شاقہ کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تاریخ کے نہ جانے کتنے مخفی پہلوؤں کے علاوہ اس کے مجہول و تاریک گوشوں کو بھی پوری روشنی میں لا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ان کی یہ تصنیف نہ صرف تلاش و تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے بلکہ عہد نبوی کے تعلق سے سیرت نبویؐ کے مبارک ذخیرے سے بھی اس کا رشتہ قائم ہوگیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے قاضی صاحب کے دوست عبدالعزیز عزت (مصری) نے اس کا عربی ترجمہ کیا ''العرب والہند فی عہد الرسالۃ'' کے نام سے کیا۔ جو ۱۹۷۳ء میں ''الہیئۃ المصریۃ'' قاہرہ سے شائع ہوا۔ سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر ونظر نے اس کتاب کا سندھی زبان میں ترجمہ کرکے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا اور اس کے علاوہ کتاب (عرب وہند عہد رسالت میں) کے چند الگ الگ اجزاء ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں بھی شائع ہوتے رہے۔ نیز کتاب کا گجراتی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا جو رسالہ ''القلم'' میں شائع ہوا۔

میسور یونیورسٹی کے لیکچرار جناب میر محمود حسن صاحب (جو عربی و فارسی کے لیکچرار تھے) نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا تھا، مگر اس بات کا سراغ نہیں مل سکا کہ آیا یہ ترجمہ ہوا کہ نہیں۔[۳۶]

(۳۶) تدوینِ سیر ومغازی

قاضی صاحب کی یہ عظیم وشاہکار کتاب اپنے موضوع پر نہایت اہم اور بیش قیمت ماخذ ہے۔ موصوف نے بڑی محنت اور تحقیق وتفتیش کے بعد اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں ہے جو ہر خاص وعام کے لیے استفادہ کا باعث ہے۔ یہ کتاب تین سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا، پھر فرید بک ڈپو دہلی سے ۲۰۰۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کتاب میں تیسری صدی تک کے علماء، سیر ومغازی اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب کو پانچ ابواب پر مرتب کیا ہے۔ پہلے باب میں تدوین سیر ومغازی کے لغوی واصطلاحی مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"سیر ومغازی سے مراد وہ جنگی مہمات ہیں جو اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہوں۔ جس جنگ میں نبی کریمؐ بذات خود تشریف لے گئے ہوں اسے غزوہ کہتے ہیں اور اگر کسی صحابیؓ کی سرکردگی میں یہ مہم روانہ کی گئی ہو تو اسے سریہ کہتے ہیں۔ یہ بس ایک عام خیال ہے مگر کلی ضابطہ نہیں، کیونکہ جنگ موتہ میں نبی کریمؐ تشریف نہیں لے گئے تھے۔ مگر پھر بھی اسے غزوۂ موتہ کہتے ہیں"۔ ۳۷

اس کے بعد مغازی کے خاص راویوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بیتے ہوئے واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے آباء واجداد کے کارناموں کا تذکرہ وتبصرہ کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے اور ان کے (یعنی اپنے آباء واجداد) کارناموں کو سراہنا اہل عرب کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا، جسے تقریباً ہر شاعر اپنے اشعار میں فخریہ طور پر بیان کیا کرتا تھا۔ لیکن آمد اسلام کے بعد ان میں کافی حد تک سدھار آیا۔ اس لیے آباء واجداد کے کارناموں کے بجائے غزوات وسرایا کا تذکرہ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ غزوات وسرایا کا ذکر مجالس ومساجد میں بھی ہونے لگا۔ قاضی صاحب نے ان مجالس میں سے مجلس "القلادة" کا حال بڑے اچھے انداز میں تحریر کیا ہے۔

سب سے پہلے اصحاب المغازی اور اصحاب الحدیث کا فرق بیان کیا ہے۔ اصحاب الحدیث کے تین امور کو جمع کرتے ہوئے (۱) آپؐ نے کیا فرمایا۔ (۲) آپؐ نے کیا کیا؟ (۳) آپؐ کے سامنے یا آپؐ کے وقت میں کیا کام کیا گیا تھا) لکھا ہے۔ اصحاب الحدیث ان تینوں امور پر غور وخوض کرتے تھے۔ ان کا مقصود بالذات علم کا جاننا ہوتا ہے اور یہ رسولؐ کی ذات سے ضمناً بحث کرتے ہیں۔

اصحاب سیر یعنی سرایا کا ذکر کرنے والے بھی درج بالا انھیں تین امور کو جمع کرتے ہیں، لیکن ان کا مقصد رسول کو جاننا ہوتا ہے۔ احکام کی بحث ضمناً کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اصحابِ سیر کو دو باتیں اور معلوم کرنی ہوتی ہیں۔ وہ یہ کہ آپؐ نے کب کونسا بات کہی؟ یا کب کونسی کام کیا؟ یا ایسا کرنے یا کہنے کی وجہ کیا تھی؟۔ دراصل اصحابِ سیرت نبی اکرمؐ کے اقوال وافعال کو مسلسل اور مربوط بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اسباب وعلت کو بھی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اصحاب الحدیث اور اصحاب المغازی

دونوں کے تحقیقی معیار جدا جدا ہیں۔

پھر مزید فرماتے ہیں دونوں یعنی اصحاب الحدیث اور اصحاب المغازی دونوں الگ الگ نہیں ہیں۔ جو اصحاب حدیث ہیں وہی اصحاب سیر بھی ہیں۔ لیکن جب انھیں سیرت پر واقعات لکھنے اور جمع کرنے ہوتے ہیں تو سیرت کے تمام مقاصد پورے کرنے پڑتے ہیں، اس لیے تحدیث روایت کے شرائط میں مناسب تبدیلی بھی کرنی پڑتی ہے''۔۳۸

زیر تذکرہ کتاب کے پہلے باب میں دور بنوامیہ کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے، لکھا ہے کہ ''بنوامیہ کا پورا دور اسلامی غزوات و فتوحات کا شاندار دور ہے۔ اس دور کے جہاد و غزوات میں صحابہ و تابعین، تبع تابعین اور امیر لشکر ہوتے تھے اور ان کے ساتھ عباد و زہاد، صلحاء، علماء، فضلاء کی ایک بڑی جماعت ہوا کرتی تھی، جن کے برکات و تجربات، تعلیمات و ہدایات اور دعاؤں کے ساتھ میں اسلامی لشکر کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔

دوسرے باب میں سیر و مغازی کے تحریری سرمائے کو پیش کر کے غزوات و سرایا کا اجمالی نقشہ بھی دے دیا ہے، جس میں ۲۷ غزوات اور ۵۷ سرایا ہیں۔ اس میں انھوں نے دو تحریری سرمایوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو قرآنِ کریم اور دوسرا عہدِ نبوی کی یادگار تحریریں۔

پہلے سرمائے میں قرآن کی سورتوں کی طرف اجمالی اشارہ کر کے بتایا ہے، کہ کن سورتوں میں کون سے غزوات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً سرایہ ابن الحضرمی سورہ بقرہ میں ہے، غزوہ بدر سورہ انفال میں، غزوۂ احد اور بدر الصغریٰ سورہ آل عمران میں اور غزوہ خندق سورہ احزاب میں، صلحِ حدیبیہ سورہ فتح میں، غزوۂ بنی نضیر سورہ الحشر میں، غزوہ حنین اور غزوہ تبوک سورہ براءۃ میں اور حجۃ الوداع سورہ المائدہ میں ہے۔ ان سورتوں میں ان تمام غزوات کا کہیں مفصل تو کہیں مجمل ذکر ملتا ہے۔

اسی طرح کتاب کے تیسرے باب میں سیر و مغازی کی ابتداء کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ ''قرنِ اول ہجری کے نصف آخر میں ہی عروہ بن زبیر، ابان بن سعید بن العاص اور ابنِ شہاب زہری نے اپنی اپنی کتابیں لکھیں، مگر افسوس کہ کچھ ناموافق حالات کی وجہ سے وہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ مگر ان کے شاگردوں نے ان کے تصنیفی کاموں کو ''ھٰذہٖ مغازی رسولؐ'' جیسے الفاظ کا ذکر کر کے ان کے ناموں اور کاموں کو دوام عطا کیا۔ اتنا ہی نہیں ان کے شاگردوں نے ان مغازی و سرایا

کے تفصیلی واقعات بھی اپنی کتابوں میں بہت پہلے لکھ دیئے تھے، مگر وہ گردشِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

اسی باب میں قاضی صاحب نے سیر و مغازی کے دو ادوار کا ذکر کیا ہے، پہلے دور کے بارے میں بتاتے ہیں کہ دورِ اوّل پہلی صدی کے نصف سے آخر تک ہے جب کہ اس دور میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا کام شروع نہیں ہوا تھا اور دوسرا دور دوسری صدی کے ابتداء سے شروع ہوا تھا۔ انھوں نے پہلے دور کی چھ کتابوں اور سات راویانِ مغازی کے حالات کا اور دوسرے دور کی سات کتابوں اور سات راویوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس میں موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۴ھ) محمد بن اسحٰق (م ۱۵۱ھ) ابو معشر سندی (م ۱۷۰ھ) سلیمان بن ہلال تیمی (م ۱۷۲ھ) عبدالملک بن محمد بن ابوبکر بن عمر بن حزم (م ۱۷۶ھ) ابراہیم بن سعید (م ۱۸۳ھ) اور محمد بن الواقدی (م ۲۰۷ھ) کے حالات اور ان کی کتب مغازی کا مکمل تعارف کرایا ہے۔ ان کے بعد مغازی کے ان راویوں کا ذکر ہے جن کی کتابیں شائع ہوئیں۔

امام اوزاعی اہل شام اور ایک مستقل فقہی مسلک کے امام ہیں۔ صدیوں تک ان کا سلسلہ چلتا رہا، قاضی صاحب نے صفحہ ۳۰۳ پر ان کے بارے میں ترتیب المدارک جلد اول صفحہ ۲۲۷ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سیر کے معاملہ میں امام اوزاعی کا پلہ امام مالک کی بنسبت بھاری تھا۔

باب چہارم میں مختلف شہروں کے علماء سیر و مغازی اور مصنفین کا تعارف ہے اس کے علاوہ کوفہ کے نو مصنفین اور بصرہ کے سات مصنفوں کا ذکر کیا ہے۔ نیز مدینۃ الاسلام بغداد کے دس علماء سیر کا ذکر بھی ہے اور اس کے علاوہ بغداد کے ایک ہشیم بن بشر کی کتاب المغازی کا اجمالی تعارف بھی ہے۔

پانچواں باب سیر کی فقہی تدوین پر مبنی ہے۔ جس میں امام محمد بن حسن شیبانی کی مشہور کتابوں یعنی "کتاب السیر الصغیر" اور "السیر الکبیر" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کتابوں کا نام السیر "الصغیر" اور "الکبیر" کیوں پڑا۔ لکھتے ہیں کہ:

> "امام محمد کی یہ کتاب "السیر الصغیر" جب اہلِ شام کے امام عبدالرحمٰن بن عمر اوزاعی کے ہاتھ میں پہنچی تو انھوں نے کہا کہ یہ کتاب کس کی ہے، تو بتایا کہ محمد عراقی کی۔ امام اوزاعی کہنے لگے کہ انھیں یہ کتاب

تصنیف کرنے کا کیا حق ہے، اہلِ عراق کو سیر و مغازی کا کیا علم۔
کیونکہ غزوات و سرایا تو شام اور حجاز میں واقع ہوئے ہیں۔ نہ کہ عراق
میں، جب یہ بات محمد عراقی صاحب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے ''السیر
الکبیر''، لکھی اور اس میں جگہ جگہ احادیثِ نبویؐ کا حوالہ دیا، جب یہ
دوسری کتاب امام اوزاعی تک پہنچی تو انھوں نے کہا کہ اگر اس میں
حدیثیں نہ ہوتیں تو میں یہ کہتا کہ محمد عراقی نے خود گڑھی ہے''۔ [۳۹]

اسی باب میں حسن بن زیاد لؤلؤی کی کتاب ''السیر'' اور عبدالرحمٰن بن عمر و اوزاعی شامی کی کتاب ''السیر'' محمد بن واقدی مدنی کی کتاب ''السیر'' داؤد بن علی اصفہانی بغدادی، صالح بن اسحاق صبری بصری وغیرہ کی کتاب ''السیر'' کا ذکر کیا ہے اور مالک بن انس اصحی مدنی کی کتاب ''الموطا'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے موطا کی کتاب الجہاد میں سیر کے مسائل تحریری شکل میں جمع کیے ہیں۔

قاضی صاحب کی یہ کتاب بڑی اہم اور مفید معلومات پر مبنی ہے، جس سے قاری بہت سی باتیں بآسانی معلوم کرسکتا ہے۔ موصوف نے اس کتاب کے ایک ایک گوشے کی کامیاب رہنمائی اس کے موضوع کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کی ہے، اگر ہم یہ کہیں یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے انفرادیت کا درجہ رکھتی ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔

اس کتاب کی تکمیل میں قاضی صاحب نے آٹھ سال کی محنت شاقہ سے کام لیا۔ اس آٹھ سال کی مدّت کے بارے میں قاضی صاحب خود فرماتے ہیں کہ:

''اس کی (کتاب تدوین سیر و مغازی) ترتیب میں آٹھ سال کی طویل مدّت کا باعث میرے محدود وسائل اور شخصی مصروفیات تھیں''۔

موصوف نے ثانوی ماخذ پر اعتبار نہ کرتے ہوئے بنیادی مراجع و مصادر کی مدد سے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان کی یہ کتاب تاریخی ذوق اور غزوات و سرایا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے معلومات کا بہترین خزانہ ہے۔

(۳۷) دیارِ پورب میں علم اور علماء

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی یہ تصنیف ''دیار پورب میں علم اور علماء'' جذبۂ حب الوطنی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ عمیق صرف تاریخ وجغرافیہ اور عرب و ہند پر ہی مرکوز نہیں تھی بلکہ انھوں نے اپنے مادر وطن دیار پورب کو بھی اپنے ذہن ودل میں بھرپور جگہ دی۔ اس لیے علماء پورب کا تذکرہ کر کے ان کی شخصیت وعزیمت و برتری اور کارناموں سے اہلِ دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ اس کتاب میں قاضی صاحب نے اضلاع پورب کی سات سو سالہ علمی ودینی تاریخ اور علمی خانوادوں کے حالات نیز مدارس و خانقاہوں کے احوال کو ۴۸۲ صفحات میں قلم بند کیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اسے بڑی آب و تاب سے شائع کیا اور اس کا جدید ایڈیشن البلاغ پبلیشرز دہلی سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اشاعت ثانی کے بعد اس کی ضخامت ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب ''دیار پورب میں علم اور علماء'' کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں سب سے پہلے لفظ ''پورب'' کی تشریح ان لفظوں میں کی ہے:

> ''مسلم دور حکومت میں دہلی کے مشرق میں صوبہ الٰہ آباد، اودھ اور صوبہ عظیم آباد پر مشتمل جو وسیع اور محدود خطہ ہے اس کو ملک پورب کہتے تھے۔ ہر صوبہ میں دارالامارت، ہر دارالامارت سے متعلق بڑے بڑے شہر ہر شہر سے متعلق قصبات اور ہر قصبہ سے متعلق دیہات تھے۔ ملک پورب کے قصبات شہروں کے حکم میں تھے۔ جن میں عالیشان عمارتیں جو جمعہ و جماعت سے معمور رہتی تھیں اسی ملک کو ہم بھی دیار پورب سے تعبیر کرتے ہیں''۔[۳۰]

پھر صفحہ نمبر ۲۲ پر دیار پورب میں اسلام کے پھیلنے کی تعیین کی اشکال ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بات ممکن حد تک یقینی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی مسلسل فتوحات کے زمانہ میں ہندوستان کا یہ علاقہ اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا اور پورے علاقہ میں بنارس کی فتوحات کو خاص اہمیت حاصل تھی اس کے بعد حضرت سالار مسعود غازی علوی اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں اسلام اور مسلمان کا شہرہ ہوا۔

دوراوّل کے بارے میں قاضی صاحب نے اپنی تحقیق کے ذریعے بتایا ہے کہ اس دور میں علماء وفضلاء کی آمدورفت تھی جس کی وجہ سے دیار پورب کے شہروقصبات اور قریات علماء وفضلاء سے معمور ہوتے گئے اور علم کی روشنی ہر سو پھیلتی چلی گئی۔ اور آخر کار ۷۷۲ھ میں سلطان فیروز شاہ نے اپنے نام ''جونا'' سے جون پور کی تعمیر کی اور اسے دیار مشرق کا مرکز بنایا۔

پھر غلام خاندان کے علماء کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے شیخ الاسلام فرید الدین لودھی کا ذکر کیا ہے کہ ان کا شمار اس دور کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ اس دور میں ان کے علم وفضل کی دھوم تھی اور لوگ ان کے فیضان علم سے سیراب ہوتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے مولانا علاؤالدین نیلی اودھی اور مولانا شمس الدین محمد بن یحیٰ اودھی کو خاص شہرت حاصل ہے۔

پھر موصوف نے اودھ کے مشہور قدوئی خاندان کے شیخ قدوۃ الدین، شیخ قطب الدین، سلطان ایلتمش، قاضی شمس الدین اور محمود ایلتمش وغیرہم کا تذکرہ کر کے مبارک پور کے بانی راجہ سید مبارک کے تبصرے پر ختم کر دیا ہے۔ پھر خلجی دور کے علم وعلماء کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ یہ دور تیس سال تک دیار پورب اور بنگال و بہار میں علمی و دینی روشنی بکھیرتا رہا (یعنی اس دور میں علمی و دینی رونق عروج پر تھی۔

زیر تذکرہ کتاب کے دوسرے علمی دور میں دیار پورب کے چار سو سالہ علمی دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور جونپور کی تعمیر و تاسیس سے لے کر لودھی سلطنت کے خاتمے تک ایک سو ساٹھ سالہ مدت کو دوسرا علمی دور قرار دیا ہے۔ اس دور میں بھی علم وعلماء کی تاریخ بڑی تابناک رہی اسی دور میں مولانا علاؤالدین دہلوی جب جونپور آنے لگے تو بادشاہ فیروز شاہ نے اپنا خاص گھوڑا سواری کے لیے دیا اور خود رکاب پکڑ کر ان کو سوار کیا، جونپور آنے کے بعد فیروز شاہ کا بیٹا شاہزادہ فتح خاں جو اس وقت حاکم جونپور تھا، اس نے شہر سے بارہ میل آگے بڑھ کر مولانا کا استقبال کیا اور دو مرتبہ انھیں سونے کے سکوں، سے تول کر ساری رقم مولانا کی نذر کر دی۔

دیار پورب کے دوسرے علمی دور میں ہی مشرقی سلطنت کا قیام ہوا۔ یعنی تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری حکمراں خواجہ جہاں ملک سرور نے ۷۹۶ھ یا ۷۹۷ھ میں مستقل حکومت کا اعلان کیا اور سلطان الشرق کا خطاب اختیار کیا۔ اس وقت سے شرقی سلطنت کا آغاز ہوا۔

اس میں چھ سلاطین ہوئے (۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور (۲) سلطان

مبارک شاہ شرقی (۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۴) سلطان محمود شاہ شرقی (۵) سلطان محمد شاہ شرقی (۶) سلطان حسین شاہ شرقی۔ آخر کار سلطنتِ شرقیہ میں دیار پورب کے سیاسی و ملکی حالات نے کروٹ لی، رفتہ رفتہ سپاہیوں میں جذبۂ نفرت بھڑکا اور ہر طرف فتنہ وفساد برپا ہوا۔ ان حالات میں خواجہ جہاں ملک سرور نے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر دیا اور سلطان الشرق کا خطاب اختیار کیا۔ اس سلطنت میں بھی علم اور علماء کی بہار رہی۔ اھ

صفحہ نمبر ۱۴۱ پر قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ جونپور کی تاسیس ۷۷۲ھ سے لے کر شرقی سلطنت کے پہلے حکمراں کے آخر زمانہ میں ۸۰۲ھ تک دیار مشرق میں علم وعلماء کی بہار تازہ رہی جب کہ اس دور میں دہلی کا مرکز حوادث وفتن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہاں کی علمی و دینی محفلیں اجڑ اجڑ کر دوسرے دیار و امصار کی طرف منتقل ہو رہی تھیں اور جونپور دار العلم، دار الامان اور دہلی ثانی بن رہا تھا۔

اس کے بعد اس دور کے یعنی شرقی دور کے چند مشاہیر ارباب علم وفضل کا تذکرہ کیا ہے اور سلاطین شرقیہ سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے اس میں موصوف نے دور شرقیہ کی تصانیف وتالیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ”تصنیف وتالیف کا سلسلہ اسی دور (شرقی) میں جاری ہوا جو آج تک قائم ہے۔

شرقی دور کے سب سے پہلے مصنف مولانا صدر الدین صاحب ہیں جو مولانا شرف الدین لاہوری، متوفی ۸۰۰ھ کے بیٹے ہیں ان کے بعد اور بہت سے مصنفین کا نام لیا ہے، جن میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی صاحب بھی ہیں۔ ان کی تصانیف میں شرح کافیہ، البحر المواج، شرح اصول بزدوی شرح قصیدہ بانت سعید وغیرہ کل سولہ تصانیف کا ذکر ملتا ہے اور پھر قاضی صاحب نے شرقی سلطنت کے زمانہ کے تقریباً ستر علماء کبار کی فہرست بیان کی ہے۔

۸۵۵ھ سے ۸۹۴ھ تک لودھیوں کا دور رہا جنہوں نے شرقی سلطنت کا خاتمہ کیا، لکھتے ہیں کہ لودھی دور حکومت میں سلطان سکندر لودھی کا دور بڑی خیر و برکت کا تھا، جو اٹھائیس سال قائم رہا، اس دور میں بہت سے علماء کرام پیدا ہوئے جن میں راجہ سید نور مانک پوری ۹۲۱ھ، شیخ فخر الدین بجنوری متوفی ۹۱۰ھ اور شیخ فخر الدین بنارسی متوفی ۹۰۶ھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً بیس علماء کا تذکرہ موجود ہے۔

دیار پورب کا تیسرا علمی دور ۹۳۲ھ سے شروع ہو کر ۱۱۳۰ھ پر ختم ہے۔ اس دور میں تیموری دور کے علم و علماء کا تذکرہ ہے اور بادشاہوں کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔ ان میں سلطان محمد بابر، سلطان محمد ہمایوں، سلطان محمد اکبر، سلطان محمد شاہجہاں، سلطان محمد عالم گیر کا مفصلاً بیان کیا ہے۔

سلطان محمد بابر کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تیموری سلطنت کا بانی و مؤسس تھا۔ اس نے جمادی الاخریٰ ۹۳۲ھ میں سلطان ابراہیم لودھی کو قتل کر کے خود تخت و تاج کا مالک بنا۔ وہ ایک کامیاب اور سیاست داں حکمراں تھا، اس کا علمی ذوق کافی عمدہ تھا اور علوم و معارف کا قدرداں بھی تھا۔ اس کے علاوہ فارسی اور ترکی کا شاعر بھی تھا اس کی بہت سی تصانیف ہیں، جن میں تصوّف کی ایک منظوم کتاب بھی ہے، اسی نے تزکِ بابری لکھی اور فقہ حنفی میں ''مبیّن'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو آج بھی تاشقند اور دیگر شہروں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسی نے خط بابری ایجاد کیا اور اسی خط میں قرآن شریف لکھ کر مکہ مکرمہ روانہ کیا تھا۔ بابر نے کل سات سال حکومت کی، اپنی حکومت کے دوران اس نے بھی علماء، فضلاء کا بڑا احترام کیا، اس نے مئو کے ایک شخص مفتی آدم بن محمد کو ایک گاؤں جاگیر میں دے کر معاش کی طرف سے بے فکر کر کے علمی و دینی خدمت کے لیے فارغ کر دیا۔ ۴۲

بابر کے بعد اس کے بیٹے ہمایوں کا ذکر ہے۔ اس کے دور حکومت میں حکومتوں کے تخت و تاج بدلتے رہے اور ہمایوں کا بیشتر زمانہ حریفوں سے نبرد آزمائی میں گذرا، اسی وجہ سے وہ ایک مرتبہ ہندوستان چھوڑ کر ایران چلا گیا تھا، مگر پھر بھی علماء و فضلاء اپنی پوری جمعیت کے ساتھ اعمال و وظائف میں مشغول رہے، اسی دور میں علاقہ سرہند سے میر علی عاشقان تشریف لائے اور اپنے نام سے ایک بستی سرائے میر بسائی جو اب ضلع اعظم گڑھ کا ایک قصبہ ہے۔ میر علی عاشقان سرائے میری کا روضہ آج بھی موجود ہے۔

ہمایوں کے بعد محمد اکبر تخت سلطنت کا مالک ہوا، یہ بھی علماء و مشائخ کا بڑا قدر داں تھا، اس نے دینی انحراف کے باوجود علم و فن کی خوب خدمت کی۔ اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا، اس نے بائیس سال حکومت کی، جہانگیر اپنے باپ اکبر کے برخلاف صحیح العقیدہ تھا۔ ۴۳

جب ۱۰۶۸ھ میں شاہجہاں تخت بادشاہت پر متمکن ہوا تو اس نے بتیس سال

حکومت کی اور بدعات ومظالم کو ختم کر کے عدل وانصاف اور امن وامان قائم کیا۔ شاہجہاں کا طویل دور سلطنت علم وعلماء کے حق میں بڑا پر بہار رہا ہے اور اسی نے جونپور کو دارالامان دارالعلم اور دہلی ثانی کے القاب سے نوازنے کے بعد شیرازِ ہند کے نام سے موسوم کیا۔ ۴۴

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''دیار پورب پر شاہجہاں نے خاص توجہ کی اس لیے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آرا کو قصبہ مئو بطور جاگیر دے دیا تھا۔'' ۴۵

جس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ قصبہ ''مئو'' شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی جاگیر میں تھا۔ اس لیے اس کا نام جہان آباد رکھا گیا۔ ۴۶

چوتھا علمی دور نوابی اودھ کا دور تھا۔ اس کے قیام کی کل مدت ایک سو تینتالیس سال ہے۔ یہ دور علم اور علماء کے لیے نامبارک دور تھا۔ کیونکہ اس دور میں علم وعلماء کی بڑی بے قدری رہی حتیٰ کہ ساری علمی رونق ایک مخصوص (وہ مخصوص طبقہ شیعوں کا تھا) طبقے میں محدود ہوگئی۔ تمام علمی ودینی خانوادے جو اس زمانے میں بڑے مشہور ومعروف تھے اور یہی لوگ علم دین کی خدمت کرتے تھے۔ انھیں زبردستی شیعی مذہب اختیار کرنا پڑا۔ کیونکہ اس وقت اودھ میں تمام بڑی شخصیات شیعی مذہب کی گرویدہ تھیں۔ مثلاً نواب برہان الملک، وزیر الممالک سعادت علی خاں نیشاپوری، نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، نواب فراز علی خاں وغیرہ۔ ۴۷

قاضی صاحب نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے تصنیف مآثر الکرام کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین رنگ وبو کی مٹی میں علم وعلماء کی گرمی باقی رہی، مگر جب ان کے وظائف اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں تو وہ بڑی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اس لیے اس دیار کے لوگوں کو حصول علم سے باز رکھ کر سپہ گری میں ڈال دیا گیا اور تعلیم و تدریس کا رواج ختم ہو گیا۔

قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی یہ تالیف بھی بہت اہم ہے۔ اس میں شیراز ہند جونپور کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل وتحقیق اور اس کے علاوہ اس دور کے علماء وفضلاء اور مشائخ کے کارناموں کو بھی روشن کیا گیا ہے، اور جو امتداد زمانہ سے ماند پڑ گئے تھے، اسے از سر نو روشن کر دیا ہے۔ ان کی اس علمی خدمات کی بدولت متعدد اکابر گوشۂ گمنامی کی نذر ہونے سے بچ گئے۔..

زیرتذکرہ کتاب میں مشہور علمی و دینی خانوادوں کا تذکرہ مطبوعہ کتابوں کی مدد سے کیا گیا ہے چند اساتذہ و معاصرین و متعلقین کے مخفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور اس میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری (بانئ مبارک پور) میر علی عاشقان سرائے میری، ملا محمود جونپوری، مولانا حافظ امان اللہ بنارسی، مولانا شیخ غلام نقشبندی گھوسوی، مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی، مولوی حسین ماہلی کا تذکرہ بھی تفصیل سے شامل ہے اور ان حضرات کی تصانیف کا بھی ذکر ہے۔

(۳۸) رجال السند والہند

رجال السند والہند قاضی اطہر مبارک پوری کی ایک عظیم تالیف ہے اسی کتاب نے انھیں شہرت و دوام عطا کیا۔ یہ کتاب دو مرتبہ زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، پہلی مرتبہ مطبع حجازیہ بمبئی سے ۱۹۵۱ء میں تین سو اٹھائیس صفحات میں شائع ہوئی۔ اس میں ان اکابرین علم و فضل کا تذکرہ تھا۔ جو سندھ و ہند کے رہنے والے تھے، اس میں انھوں نے ساتویں صدی ہجری سے پہلے کے ایک سو سے زیادہ ایسی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے علم و فضل، تحقیق و مطالعہ، تدریس و تعلیم، اصلاح و ورع، اصلاح و تزکیہ، سیاست و حکومت اور طب و جغرافیہ، نجوم و ہیئت، یا اسی طرح کے دیگر میدانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں ساتھ ہی ان مشہور شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، جو سندھ و ہند میں پیدا ہوئے لیکن ان کی رہائش بیرونِ ملک ہی میں ہوئی اور کچھ ان لوگوں کا بھی تذکرہ ہے جو سندھ و ہند میں پیدا نہیں ہوئے، لیکن ان کے آباء واجداد اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔

دوسرے ایڈیشن کے بعد اس کی ضخامت بڑھ کر پانچ سو اٹھاسی صفحات ہوگئی۔ اسے دارالانصار قاہرہ (مصر نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اور قاضی صاحب کی خواہشات کا بھی احترام کرتے ہوئے مولانا عبدالرشید بستوی (قاسمی) صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی ابتداء میں قاضی صاحب نے مشہور شہروں اور شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے شاندار لفظوں میں ان کا تعارف کرایا ہے اور قارئین کی آسانی کے لیے تمام علماء اور شہروں کے ناموں کو حروف تہجی کی ترتیب پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں ''باب الآباء'' اور باب الابناء کے عنوان سے ان اعلام کا تذکرہ کیا ہے، جن کا نسب ان کے والد یا بیٹوں کی طرف سے ہے۔

اور ایک باب ''باب المجاہیل'' کے عنوان سے بھی ہے۔ جس میں مولانا نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو نام ان میں ہیں ان کا صحیح علم نہیں ہے کہ آیا ان کا تعلق سندھ یا علاقہ ہند سے ہے یعنی ان ناموں کی کوئی تصریح نہ ہوسکی۔ بہر حال انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ مستند اور معتبر حوالوں کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے بلکہ ان رجال کا تذکرہ جس کتاب میں ملا من وعن اس کو ویسا ہی نقل کر دیا اور جہاں کہیں اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں تبصرہ بھی کیا ہے، تو وہاں قوسین میں قال القاضی لکھ دیا ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ بات انھوں نے اپنی طرف سے کہی ہے۔

اگر کسی متن میں کوئی غلطی تھی تو اس کو بالکل اسی طرح سے نقل کر دیا ہے جیسے راجہ ''الور'' مہروک کے بجائے ''الرا'' ہوگیا ہے مگر قاضی صاحب نے بالکل اسی طرح سے نقل کر کے لکھ دیا ہے اور بعد میں ''قال القاضی'' لکھ کر تصحیح کر دی ہے۔ (لکھا ہے کہ مہروک بن رائق تیسری صدی میں ''الور'' کا راجہ تھا اور عبارت میں ہر جگہ ''الرا'' ہوگیا ہے۔ وہ یا تو نقل کی غلطی ہے یا طباعت کی۔ ۴۸

قاضی صاحب نے اس کتاب میں سب سے پہلے ''باب الف'' میں احمد بن السندی البغدادی ابوبکر الزاہد کا ذکر کیا ہے اور ان سے منقول کئی احادیث و روایات کردی ہے۔

لکھتے ہیں:

''استعملنی رسول الله ﷺ علی عمل فلمّا رجعت قال کیف وجدت امارۃ؟ قلت یا رسول الله! ما ظننت إلا أن الناس کلّهم خول لی والله لا آتی علی عمل ما دمت حیا''۔ ۴۹

ترجمہ: (مجھے رسولؐ نے ایک جگہ عامل بنا کر بھیجا پس جب میں واپس آیا تو آپؐ نے معلوم کیا کہ گورنری کیسی لگی؟ میں نے عرض کیا اللہ کے رسولؐ میں نے سمجھا کے سارے کے سارے انسان میرے غلام باندی ہیں۔ خدا کی قسم جب تک بقید حیات رہوں گا کسی طرح کی امارت ہرگز قبول نہ کرونگا''۔

قاضی صاحب کو احمد سندھی بغدادی کی تاریخ پیدائش یا وفات کا علم نہ ہوسکا تو انھوں نے احمد سندھی کے استاذ یعقوب بن ابراہیم دورقی متوفی ۲۵۲ھ کے سن وفات سے اندازہ لگایا ہے کہ احمد سندھی تیسری صدی ہجری کے شخص تھے''۔۵۰

مولانا نے یہ صراحت کر کے نیچے قوسین میں ''قاضی'' لکھ دیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات ان کی طرف منسوب ہے۔

اس کتاب میں تمام اکابرین رجال کا ذکر ہے۔ ان کی پیدائش، سن وفات اور ان کے علمی کارنامے، روایات و واقعات وغیرہ موجود ہیں غرضیکہ پوری کتاب انھیں اذکار و ابحاث کا مجموعہ ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ قاضی صاحب نے اس میں ان رجال کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ جن کا لقب صرف سندھی یا ہندی تھا، یعنی وہ سندھ اور ہند کے باشندے نہیں تھے اور نہ ہی ان کا کچھ ایسا تعلق تھا، بس یوں ہی شوقیہ نام کا جز بنالیا تھا، ان لوگوں کے تذکرہ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کے پاس ان کے سندھی یا ہندی ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔

اس موضوع پر قاضی صاحب سے پہلے بھی لوگ بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ سب سے پہلے مولانا آزاد بلگرامی نے اپنی کوششوں سے ''سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان'' لکھی، جو عربی میں ہے اور پھر مولانا آزاد بلگرامی نے ہی فارسی میں ''مآثر الکرام'' بھی لکھی، جس میں بہت مفید معلومات مہیا کی ہیں اور اسی موضوع سے متعلق رحمٰن علی ناروی نے ''تذکرہ علماء ہند'' تالیف کی۔ سید عبدالحیٔ حسنی نے ''نزہۃ الخواطر'' لکھی جو علمی حلقوں میں بڑی مقبول ہوئی اور آج بھی قابل تحسین ہے۔ مگر پھر بھی اس موضوع پر مفصل مطالعے کی ضرورت باقی تھی جسے قاضی صاحب نے لکھ کر پورا کردیا۔

اس کتاب (رجال السند والہند) کی اہمیت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (جسٹس سپریم کورٹ پاکستان) کے اس ریمارک سے اور بڑھ جاتی ہے، جو انھوں نے ایک طالب علم سے گفتگو کے دوران کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''عراق کے ایک مشہور عالم پاکستان تشریف لائے جب وہ کراچی آئے تو وہ میرے مہمان ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ میں متحدہ ہندوستان کی علمی، تہذیبی اور اسلامی تاریخ پر تحقیق کر رہا ہوں، اسلامی ہند کی

شخصیات علماءِ محدثین اور اعاظم رجال پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں اور ایسے ماخذ و مراجع کی نشان دہی کریں جو عربی زبان میں ہو تاکہ میرے لیے ان سے استفادہ آسان ہو، محمد تقی عثمانی صاحب نے ان سے کہا کہ پورے ہندوستان (بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش) میں آپ کے معیاری کام کے لیے صرف دو کتابیں کارآمد ہیں، ایک مولانا حکیم عبدالحئی رائے بریلوی کی ''نزہۃ الخواطر'' اور دوسری قاضی اطہر مبارک پوری کی ''رجال السند والہند'' تیسری اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ اھ

''رجال السند والہند'' کی وجہ تالیف کے بارے میں قاضی صاحب اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ ''ایک روز احمد امین کی کتاب ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کر رہا تھا، جس میں مشہور امام لغت و ادب ابن الاعرابی کے متعلق کان اصلہ سندیًا دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہلِ علم وفضل سندی و ہندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں ہے، بس اسی وقت سے ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کر لیا اور اس (کتاب کا سلسلہ چل پڑا جو آخر میں رجال السند والہند کی شکل میں سامنے آیا''۔ ۵۲

یہ کتاب ''رجال السند والہند'' شائع ہو کر جب علمی حلقوں میں پہنچی تو بہت مقبول ہوئی۔ اہل علم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا ہی حتی کہ ان لوگوں نے بھی اسے اپنے گھر اور کتاب خانوں کی زینت بنایا جنھیں عربی زبان سے واقفیت بالکل نہیں تھی۔ اس کی شہادت اعجاز احمد صاحب کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں کہ ''قاضی صاحب کی تصنیف ''رجال السند والہند'' چھپ کر آئی تو والد صاحب اس کتاب کو خرید کر گھر لائے حالانکہ وہ عربی زبان سے ناواقف تھے، مگر اس کے باوجود بھی اسے خرید لیا۔ ۵۳ اس کے علاوہ اس کتاب پر ان لوگوں نے اپنے نظریات وخیالات اور تبصرے پیش کیے جو اس میں شامل کیے جا رہے ہیں۔

(۱) شیخ عبدالعالی عقباوی عصو لجنۃ الازہر و مؤتمر اسلامی نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: مؤلف کی یہ محنت قابل قدر ہے۔ اپنی اس کتاب کے ذریعے انھوں نے ان رجال علم کی معرفت آسان کر دی جنھوں نے ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک اسلام کی خدمت کی مؤلف نے ان شخصیات کو اجاگر کر کے آسان ترتیب میں مرتب کر دیا ہے۔ جو کوئی ان مراجع و مآخذ پر نظر ڈالے گا وہ اس بیش

قیمت کتاب کی تالیف کا بخوبی اندازہ لگالے گا۔ ۵۴

(۲) مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے تبصرے سے یوں نوازتے ہیں: ''قاضی اطہر مبارک پوری کا نام پڑھے لکھوں کے لیے نامانوس نہیں، مدتوں سے وہ اسلامی تاریخی ملی عنوانات پر برابر لکھ رہے ہیں اور اب تک مقالات ومضامین کا پورا انبار لگا چکے ہیں اور پھر مزید تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں کہ قاضی صاحب نے یہ کتاب تیار کر کے ہندوستانی اہل قلم کا سر دنیائے اسلام میں بلند کیا ہے، اس پر وہ اور ان کے پبلیشر دونوں قابل مبارک باد ہیں۔ ۵۵

(۳) مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان نے اپنے نجی خط میں اس طرح تذکرہ کیا ہے: ''حضرت العلامہ قاضی ابوالمعالی اطہر مبارک پوری کی تصنیف ''رجال السند والہند'' کے مطالعہ سے مستفید اور محظوظ ہوا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے سندھ وہند کے مایہ فخر وامتیاز مگر تاریخی مظلوم گروہ کے تراجم اور تذکرہ کو ایک تنظیمی صورت میں پیش کر کے ایک بڑے خلاء کو پر فرمایا ہے''۔ ۵۶

(۴) قاضی صاحب کی اس کتاب ''رجال السند والہند'' پر شیخ محمود ابن النذیر الطرازی مدنی مرحوم نے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ جس سے اس کی اہمیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس کی منظوم صورت یہ ہے۔

هنيئا لكم يا سادة العصر أبشروا
كتابٌ "رجال السند والهند" ينشروا
كتابٌ به السند السنية تزدهى
وسفرٌ به الهند الحكيمة تفخر
كتابٌ قضىٰ فى جمعهٖ نصف عمره
مكر منا القاضى المفسر اطهر
اديب، فقيه، ناقدٌ، متكلمٌ
بليغٌ، ولكن لم تلده زمخشرٌ ۵۷

(۱) اے وقت کے سرکردہ لوگوں! تمہیں مبارک ہو خوش ہو جاؤ کہ کتاب رجال السند والہند شائع ہو رہی ہے۔

(۲) ایک ایسی کتاب جس پر تابناک خطۂ سندھ کو ناز ہوگا۔
ایک ایسی دستاویز جس پر حکمت سے لبریز سرزمین ہند فخر کرے گی۔
(۳) ایک ایسی کتاب جس کی تالیف میں ہمارے معزز قاضی و مفسر اطہر (مبارک پوری) نے آدھی عمر کھپادی۔
(۴) وہ ادیب ہیں، فقیہ ہیں، ناقد اور بلیغ ہیں مگر ان کی پیدائش زمخشر کی نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قاضی صاحب کی یہ کتاب اپنے موضوع، مطالب اور فن کے لحاظ سے ایک اچھوتے افکار وتصورات کی وجہ سے دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے کیونکہ اگر اس میں موصوف نے اسلامی ہند کے قرن اول کے علماء وفقہاء کا ذکر کیا ہے تو ان کی علمی، دینی، لسانی وسماجی تاریخی پس منظر کو بھی واضح کیا ہے اور اس دور کے تجار د متکلمین اور اہل اسلام کے مختلف فرقوں اور عقائد ونظریات سے تعلق رکھنے والے حضرات کا بھی تذکرہ کیا ہے جو مزید دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے اور مشہور مقامات اور امصار کا تبصرہ بھی بہت معلومات مہیا کرتا ہے جس سے اس کتاب کی خصوصیت واہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور مطالعے کے بعد موصوف کا عبقری ذہن، تبحر علم، وسعت مطالعہ، قوتِ فکر واستدلال کا بھی نہ مٹنے والا نقش ثبت ہوجاتا ہے۔

(۳۹) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں

زیر تذکرہ کتاب ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے تین سو چالیس صفحات میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی اور تیسرا ایڈیشن تنظیم فکرونظر سندھ سے شائع ہوا اور مصر کے ڈاکٹر عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرکے ''حکومات العرب فی السند والهند'' کے نام سے شائع کیا۔ اسے اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان نے اپنے ''مجلہ الدراسات العلمیہ'' میں قسط وار شائع کیا پھر مکتبہ آل ید اللہ بکریہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ ۵۸

قاضی صاحب کی یہ کتاب تیسری صدی سے پانچویں صدی تک کی پانچ بڑی ریاستوں، دولتِ ماہانیہ سنجان، دولتِ ہباریہ منصورہ، دولتِ سامیہ ملتان، دولت معدانیہ مکران اور دولتِ معتلبہ طوران کے عروج وزوال کی ایک مفصل اور تحقیقی کتاب ہے۔

مولانا نے اس کتاب کو لکھنے کے لیے عربی و اردو کی بہت سی معتبر و مستند کتابوں سے مدد لی جن میں مسعودی کی کتاب اخبار الزماں (مصر) الاصابہ فی تمیز للصحابہ ابن حجر (مصر) عیون الانباء فی طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ (مصر) اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات (الٰہ آباد)، کتاب الفہرست، ابن ندیم (مصر) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قاضی صاحب نے ان مذکورہ بالا پانچوں ریاستوں کے ملکی انتظامات، حدودِ سلطنت، صنعت و حرفت، معاش و معیشت، اس دور کے محدثین و مؤرخین، سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے کارناموں کو تفصیل سے پیش کیا ہے اور عربوں کے دور حکومت میں، ہندوستان کی سیاسی و سماجی، علمی و دینی اور تمدنی زندگی پر اسلام کے اثر و نفوذ کی مکمل تاریخ بیان کی ہے۔ نیز عربوں کی حکومت کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں عربوں نے پونے تین سو سال حکومت کی اور خلافتِ عباسیہ کی ماتحتی میں ان حکومتوں کو ہندوستان میں قیام و ثبات ملا، عرب حکمرانوں نے ہندوستان میں علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لیے نہ صرف زمین ہی ہموار کی بلکہ اس چمن (ہندوستان) کی آبیاری بھی کی اور ہندوستان کو ایک قابلِ قدر حصہ بنایا۔ جب دولت غزنویہ نے ۳۶۶ھ میں ہندوستان پر قبضہ کیا تو اسے ایک سجا سجایا گلستان ملا، جس کی بدولت اُس نے ہندوستان میں بڑی شاندار اور کامیاب حکومت کی۔ جس سے اس ملک کو عالم اسلام میں بڑی عظمت و اہمیت حاصل ہوئی۔ جب دولتِ غزنویہ زوال پزیر ہوئی تو دولت غوریہ کا ظہور ہوا، جس نے عربوں اور غزنویوں کے گلستانِ ہند کی وراثت سنبھالی اور ۶۰۴ھ تک اس ملک میں اسلامی علوم اور دینی ذہن و مزاج کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے ذوق کے مطابق کام کیا۔ اب خواہ دولتِ غزنویہ ہو یا دولتِ غوریہ دونوں نے دولتِ عربیہ کی جانشینی و وراثت پا کر ہندوستان کی حکومت اور عربوں کے ادھورے خاکے میں رنگ بھرا''۔ ۵۹

مولانا نے دولتِ ماہانیہ سنجان کے حالات باون (۵۲) صفحات میں مکمل کیے ہیں۔ حالانکہ قاضی صاحب کا یہ مقالہ "دولتِ ماہانیہ سندان" کے عنوان سے مجلّہ "معارف" اعظم گڑھ دارالمصنفین میں مارچ، اپریل اور مئی کے شمارے میں ۱۹۵۹ء کو شائع ہو چکا تھا۔ بعد میں مولانا نے نظرثانی کر کے اسے مزید وسعت دی۔

دراصل سندان اور سنجان ایک ہی نام ہیں۔ یہ ہندوستان کا ایک مرکزی شہر ہے۔ بنو سامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے سندھ کی الجھنوں سے ہٹ کر اس پر ۱۹۸ھ میں قبضہ کر لیا اور اپنی خود مختار حکومت قائم کر کے اپنی سیاسی بصیرت و دور اندیشی سے کام لے کر خلافت عباسیہ سے تعلق قائم کر لیا۔

اس کی صراحت قاضی صاحب نے علامہ بلاذری کی کتاب فتوح البلدان کی مدد سے اس طرح کی ہے:

> "منصور بن حاتم کا بیان ہے کہ فضل بن ماہان مولیٰ بنی سامہ نے سندان کو فتح کر کے اس پر غلبہ حاصل کر لیا اور خلیفہ مامون کی خدمت میں ہاتھی کا تحفہ بھیجا اور اس سے خط و کتابت جاری رکھی" [۶۰]

دولتِ سنجانیہ کے تین حکمراں ہوئے فضل بن ماہان، محمد بن فضل بن ماہان، ماہان بن فضل بن ماہان۔ ان حکمرانوں کے کارناموں میں سب سے اہم کارنامہ غلامی کے باوجود خود مختار حکومت، سندان میں عظیم الشان مسجد کی تعمیر جو اپنی شان و شوکت کے باعث اسلام کا پہلا قلعہ تھی اور حدودِ سلطنت کی وسعت و بحری ڈاکوؤں کا صفایا وغیرہ تھا۔ ان مفید اور اہم کارناموں کا اثر غیر ملکی تاجروں اور مقامی باشندوں پر بھی پڑا مگر دولت ماہانیہ کی یہ عظیم حکومت کل اٹھائیس یا انتیس سال تک قائم رہی۔ یعنی ۱۹۸ھ سے ۲۲۷ھ تک۔ ان میں آپسی اختلاف شروع ہو جانے کی وجہ سے یہ خود مختار مسلم ریاست ختم ہو گئی۔

مولانا نے اس کے کئی ذیلی عناوین قائم کیے ہیں جو اس طرح ہیں: نظامِ حکومت، مذہب اور خلافت سے تعلق، ماہانیوں کے دور میں سندھ کے عباسی عمال و حکام، مملکتِ سندان کی اہمیت و مرکزیت، زرخیزی اور ارزانی، صنعت و حرفت، بحری تجارت اور غیر ملکی تاجر، مسلم شخصیتوں کی یادگاریں، سندان کے ماہانی دور کے علوم اور علماء جن میں منصور بن حاتم نحوی، ابو عبادہ بحتری وغیرہ شامل ہیں۔

اور وہاں کے ارباب علم وفن میں محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی کوفی محمد بن حارث بیلمانی، محمد بن ابراہیم بیلمانی ابومحمد ہندی بغدادیؒ، وغیرہ کافی شہرت یافتہ ہیں۔

دولت ہباریہ منصورہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''حضرت ہباریؓ بن اسود اسدی قرشی مشہور صحابی تھے۔ یہ فتح مکہ کے بعد مقامِ جعرانہ میں خود حاضر ہو کر ایمان لائے اور وصال نبوی کے بعد ملک شام چلے گئے۔ یہ نہایت جری اور بہادر آدمی تھے، ان کی اولاد بھی ان خصوصیات کی حامل تھی۔ حضرت ہباری کی اولاد شام، بصرہ، سیراف، سندھ، بلخ مصر میں بڑی غلبہ واقتدار کے ساتھ رہی''۔ ۶۱

منذر بن زبیر ہباری قرشی ۱۰۵ھ میں سندھ آیا، مگر حالات اتنے ابتر تھے کہ کامیاب حکومت نہ کر سکا اور روپوشی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اس وقت ہشام بن عبدالملک اموی کی خلافت تھی اور جگہ جگہ شورشیں برپا تھیں۔ لیکن جب بنوامیہ کے خاتمہ کا اور بنوعباس کے اقتدار کا زمانہ آیا تو اس انقلابی دور میں اس نے سندھ سے قرقیسیا تک اپنے غلبہ واقتدار کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ۱۳۲ھ میں اسے گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا گیا۔

سندھ میں دولت ہباریہ کی مدت تاسیس ۲۴۷ھ رہی اور ۲۸۶ میں خود مختار حکمراں عمر بن عبدالعزیز کی اولاد عمر بن منذر نے حکمرانی کی لیکن ۴۱۶ھ یا ۴۱۷ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۶۲

ان تمام تفصیلی تذکروں کے بعد مولانا نے دولتِ ہباریہ کے مذہبی امور کا بھی جائزہ لیا ہے، مگر ان کے فقہی مسلک کا کوئی قوی ثبوت نہیں مل سکا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''ہباریوں کا پورا دور حکومت دینی اور مذہبی اعتبار سے بہت شاندار تھا وہ پکّے سنی تھے اور خلافتِ عباسیہ کے طرف دار و مطیع تھے''۔ ۶۳

مزید لکھا ہے کہ:

''قرینۂ قیاس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ (ہباری) امام داوٗد ظاہریؒ (م ۲۷۰ھ) کے مسلک پر رہ کر عامل بالحدیث تھے۔'' ۶۴

لیکن چوتھی صدی ہجری میں مشرقی عالم اسلام میں ظاہری مسلک کو اتنا فروغ ہوا کہ اس نے حنبلی مسلک کی جگہ لے لی اس کی تصریح مقدسی کی اس تحریر سے ہوتی ہے:

"کہ اس زمانہ کے اہل سنت کے چار فقہی مذاہب میں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور داؤدیہ ہیں"۔ ۶۵

مولانا نے دولتِ ہباریہ منصورہ کے دارالسلطنت، نظام حکومت، ملکی انتظامات، مشہور مقامات، اسلامی علوم اور علماءِ اسلام کے تفصیلی تذکرے کے بعد دیبل کی علمی مرکزیت اور وہاں کے علماء ومحدثین، بوقان کی علمی مرکزیت اور وہاں کے علماء محدثین اور الور کی مرکزیت ومحدثین پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان سے متعلق ذیلی عناوین بھی قائم کیے ہیں۔

دولتِ سامیہ کے حالات بیان کرنے کے لیے مولانا نے متعدد کتابوں سے مدد لی، مثلاً کتاب المعارف ابن قتیبہ دینوریؒ (م ۲۷۶ھ)، کتاب المحبر ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادیؒ (م ۲۴۵ھ)، کتاب نسب قریش مصعب زبیریؒ (م ۲۳۲ھ)، کتاب جمہرۃ الانساب العرب، ابن حزم اندلسیؒ (م ۴۵۶ھ)، کتاب الاغانی، ابوالفرج اصفہانی وغیرہ۔

قاضی صاحب نے ان کے ابتدائی حالات کی تفصیل خاص طور پر بیان کی ہے کیونکہ ان کے دشمنوں نے ان کی حیثیت ہر طرح سے پامال کرنے کی کوشش کی، اس لیے مولانا نے درج بالا مورخین ومصنفین کی کتابوں سے ان کے بیانات کی روشنی میں بنوسامہ کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔

ابن قتیبہ کے بیان کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ "قبیلۂ قریش میں فہر نامی ایک مشہور شخص تھا، جس کا لقب قریش تھا اور اسی سے پورا قبیلہ مشہور ہے، جس سے قریش خاندانوں کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ لوئ بن غالب بن فہر کے سات بیٹے تھے: (۱) کعب بن لوئ (۲) عامر (۳) سامۃ (۴) سعد (۵) خزیمہ (۶) حارث (۷) عوف۔ ان ساتوں میں کعب بن لوئ سے رسولﷺ کا نسبی تعلق ہے اور سامہ بن لوئ سے ملتان کے سامی حکمراں ہیں۔ ۶۶

۸ھ میں ابوزید انصاری اور حضرت عمرو بن عاصؓ نے اسلام کی دعوت دی تو عام عربوں کے ساتھ ساتھ بنوسامہ بھی اسلام لائے۔ ۶۷

لیکن قاضی صاحب نے مصعب زبیری، امام ابن حزم اور مسعودی کے حوالے سے بنوسامہ کے مرتد ہونے کی بھی خبر دی ہے۔ مسعودی کے بیان کی روشنی میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

"حارث بن راشد ناجی تین سو آدمیوں کو لے کر چلا گیا اور یہ سب کے سب مرتد ہو کر نصرانی بن گئے"۔ ۶۸

قاضی صاحب نے بنوسامہ کے حالات تقریباً چالیس پینتالس صفحات میں مکمل کیے ہیں۔ جن کی تفصیل ان مختصر صفحات میں لکھنا ناممکن ہے۔ بنوسامہ سے متعلق جو ذیلی عنادین ہیں وہ بھی بڑے دلچسپ ہیں، وہ عناین درج ذیل ہیں:

(۱) بنوسامہ کا ذکر زبانِ رسولؐ پر (۲) عمان میں دعوتِ اسلام اور بنوسامہ کا قبولِ اسلام (۳) وفد بنی سامہ اور حضرت خریت بن راشدؓ کی رسولؐ سے ملاقات (۴) حضرت لقیط بن عباد سامی کی دربارِ نبوّت میں وفات (۵) خلافتِ راشدہ میں امرائے بنوسامہ کی شان وشوکت (۶) حضرت خریت بن راشد جانی اور بنوسامہ پر طرح طرح کے الزامات (۷) بنوسامہ کے ارتداد کی داستان (۸) بنوسامہ کے نسب میں طعن کی داستان (۹) بنو سامہ کی چند اہم شخصیتیں وارباب علم وغیرہ وغیرہ۔

اور اس کے علاوہ وہاں کے ملکی انتظامات، حدود سلطنت اور مشہور مقامات کی تفصیل موجود ہے۔

دولتِ معدانیہ مکران کے بارے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ خلافتِ فاروقی میں ہی مسلم فاتحوں کے قدم اس سرزمین پر آ چکے تھے اور ان کا فاتحانہ داخلہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ہوا۔

چوتھی صدی ہجری کے وسط میں مکران کے حالات بدل گئے اور عیسیٰ بن معدان نے غلبہ واقتدار حاصل کر کے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر دیا اور اس کا تذکرہ اصطخری نے ان لفظوں میں کیا ہے:

والمتغلب علیها رجل بعیسیٰ بن معدان ویسمی بلسانهم مهراج وقیامة بمدنیة کیز.

ترجمہ: عیسیٰ بن معدان نامی ایک شخص مکران پر قابض ودخیل ہوا جسے لوگ اپنی زبان میں مہراج کہتے ہیں اس کی جائے قیام شہر کیز ہے۔ ۶۹

مولانا نے دولتِ معدانیہ کے تینوں حکمراں کا ذکر کر کے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کون کس صدی میں حکمراں تھا اور کب تک اس کی حکومت رہی۔ "دولتِ معدانیہ کا تیسرا حکمراں عیسیٰ بن معدان کافی دلیر تھا، اپنے والد کے انتقال کے بعد اس نے مکران پر مکمل قبضہ کر کے اپنی فوج تیار کر لی۔ غزنوی جیسی زبردست طاقت کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر

جنگ میں مارا گیا۔ یعنی دولتِ معدانیہ مکران کا خاتمہ سلطان غیاث الدین غوری کے ہاتھوں ۵۷۱ھ میں ہوا''۔ ۷۰

علاقۂ مکران کے حدودِ سلطنت، مشہور مقامات اور وہاں کے طبعی حالات، صنعت وحرفت اور تجارت کا تذکرہ جامع انداز میں لکھ کر پوری معلومات مہیا کی ہے۔

عرب جغرافیہ نویس مکران کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ایک وسیع وعریض شہر یعنی (ولایت) ہے جو ساحل سمندر پر واقع ہے۔ اس شہر کا عجمی نام ماہ وکرمان تھا مگر کثرت استعمال کی وجہ سے مکران ہوگیا۔ ۷۱

مولانا نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے کہ مکران کسی خاص شہر یا مقام کا نام نہیں ہے، بلکہ پورے ساحلی علاقے کا نام ہے۔ اس کے دو کھلے ہوئے حصے ہیں، ایک بلاد وامصار کا حصہ ہے، جو اپنے علاقائی ناموں سے مشہور ہے اور دوسرا کئی بڑے بڑے علاقے اپنے نام سے مشہور ہیں۔

مولانا نے دولتِ متغلبہ طوران کی تفصیل بھی کئی صفحات میں لکھی ہیں، جس میں طوران کے غلبہ واقتدار کی ابتداء، قندابیل پر روسائے عرب کا قبضہ اور عمر بن جمیل کے ہاتھوں ان کا خاتمہ، قندابیل پر محمد بن خلیل کا قبضہ اور عمران بن موسیٰ برمکی کے ہاتھوں اس کا خاتمہ، طوران سے دولتِ متغلبہ کا غیاث الدین غوری کے ہاتھوں ۵۷۱ھ میں خاتمہ، امرائے طوران کا نظام حکومت، حدودِ سلطنت، مشہور مقامات کا ذکر کر کے طوران کی پیداوار تجارتی اشیاء، آبادی، طرز زندگی اور لباس وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

علاقۂ طوران کے بارے میں خبر دیتے ہیں کہ وہاں کے مسلمان خارجی تھے جو وہاں کے غیر مسلموں پر غالب رہتے اور غیر مسلموں میں عام طور سے بدھ تھے، وہاں کے باشندوں میں تہذیب وتمدن نہیں پایا جاتا، نہ ہی ان کے لباس اور طرز زندگی میں کوئی فرق تھا وہ وحشیوں کی طرح زندگی گذارتے تھے۔

وہاں کی زبان اور دین واخلاق پر بھی زبردست تذکرہ ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قاضی صاحب کی یہ کتاب اپنے ایک ایک لفظ میں لذت اور دلچسپی سموئے ہوئے ہے۔ قاری اتنی اہم اور دلچسپ کتاب سے کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

سفرنامے

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری تحقیق و تصنیف، شعر و ادب، درس و تدریس اور صحافت و خطابت کی لامحدود صلاحیت و خصوصیت کے ساتھ آیتِ قرآنی ''فسیروا فی الارض'' کی عملی تصویر بھی تھے۔ اپنی بیش بہا مصروفیات کے باوجود انھوں نے ملک و بیرونِ ملک کے متعدد اسفار کیے اور ہر سفر سے علمی، دینی، تاریخی اور تمدنی مقاصد وابستہ تھے، ہر سفر کی روداد ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع ہوتی تھی، جس میں علم و تاریخ، تہذیب و تمدن کی معلومات اور بہت سے عبرت آمیز واقعات شامل ہوتے تھے۔

مولانا نے اپنے سفرناموں میں ہر علاقہ و خطّہ کی بنیادی تاریخ، بادشاہوں اور حکمرانوں کی تعمیر کردہ بلند و بالا عمارات، قلعہ جات، مساجد و مینار، عجائبات و جغرافیائی حالات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

مولانا کا سفرنامہ مجموعے کی صورت میں بعنوان ''قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے'' سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۵ء میں کاکوری آفسیٹ لکھنؤ سے ہوئی اور مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے اسے تین سو انچاس (۳۴۹) صفحات میں ترتیب دیا ہے۔

پورا مجموعہ اٹھارہ (۱۸) سفرناموں پر مشتمل ہے۔ ان میں دو سفر حج سے متعلق تاثرات ہیں اور تیسرا سفر قاہرہ کا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۴ء میں چوتھے حج کی ادائیگی کے وقت چھ ماہ تک افریقہ اور عرب ممالک کی سیاحت بھی کی جس میں سعودی عرب کے شہروں میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، الخبر، دمام، ریاض، درعیہ کے علاوہ کویت، شام اور مصر وغیرہ بھی شامل تھے۔

مولانا نے ان تمام علاقوں کے تاریخی مقامات، کتب خانوں اور یونیورسٹیوں سے افادہ کیا اور مغربی افریقہ کے ملک غانا کے دارالحکومت ''اکرا'' میں قیام کر کے وہاں کی بام یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ عربی سے بھی مستفید ہوئے اور کئی کتابوں کے اقتباسات بھی نقل کیے۔ جس میں امام سمعانی کی کتاب ''الاملاء والاستملاء'' ابن حوقل کی کتاب ''صور

الارض" اور ابن اخون کی کتاب "معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ" وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔

قاہرہ کے ہوٹل لوکنگی میں کئی دن تک مقیم رہ کر وہاں کے علماء، فضلاء، اساتذہ، تلامذہ سے ملاقاتیں کیں اور ساتھ ہی فسطاط، جیزہ، حلوان وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "پورا شہر قاہرہ دارالعلم اور دارالکتب معلوم ہوتا تھا، قبطی کے عجائب خانہ میں کئی منزلہ شاندار عمارتوں میں فراعنۂ مصر کے مجسمے، ان کے استعمال کے سامان اور حنوط کی ہوئی لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر کی منزل میں چودہ فرعون کی لاشیں صندوقوں میں قطار سے پڑی ہیں۔ جن میں فرعونِ موسیٰ کی بھی لاش ہے۔ فسطاط کی جامع مسجد عمرو بن عاصؓ کے ایک گوشے میں حضرت عمرو بن عاصؓ کا مزار لکڑی کے حظیرے میں ہے اور اسی علاقے میں امام شافعیؒ کا مزار بھی ہے۔

بھوپال کا تبلیغی اجتماع-۱۹۵۶ء

بھوپال کے تبلیغی اجتماع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بھوپال ایک زمانہ میں ہندوستان کا خوش نصیب خطہ رہ چکا ہے، جہاں ملک و بیرونِ ملک کے بڑے بڑے ارباب علم وفن رہا کرتے تھے۔ اس مرکز سے علمی مجلسیں وابستہ رہا کرتی تھیں۔ اعظم گڑھ کے علمی رجال اور بعض علمی اداروں کو اس سے خاص تعلق رہا ہے۔ مرحوم نواب صدیق حسن خاں صاحب کے زمانے میں یہاں مولانا سلامت اللہ جیراج پوری محتسب وعظ وتذکیر کرتے تھے۔ مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال نے علامہ شبلی نعمانی کو سیرت النبی کی تصنیف کے لیے گراں نقد رقم عنایت فرمائی تھی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کو اس سے کافی مدد ملتی تھی۔

بمبئی سے ایلورا تک-۱۹۵۷ء

اس سفر میں قاضی صاحب نے کئی بزرگ ہستیوں کی زیارت کی، حضرت زرزری بخشؒ (م۷۰۵ھ) حضرت شیخ برہان الدینؒ غریب (م۷۳۸ھ) حضرت راجوؒ قتال (م۷۳۱ھ) مولانا فریدالدینؒ ادیب (م۷۳۰ھ) حضرت خواجہ حسن شیرازیؒ شیخ ابن الدینؒ داؤد شیرازی (م۷۰۱ھ) حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ شہنشاہ ہند (م۱۱۱۸ھ)، سحبان الہند علامہ آزاد بلگرامیؒ وغیرہ کے علاوہ اور بھی بہت سے ارباب علم کا نام موجود ہے۔

اور آخر میں ایلورا کے غار کی خصوصیت و اہمیت پر نظر ڈال کر مرہٹواڑہ کے

مسلمانوں کے خصوصی مسائل پر اس سفر کو ختم کیا ہے۔

دہلی کا ایک یادگار سفر-۱۹۶۲ء

قاضی صاحب نے دہلی کو اسلامی تاریخ کی ایک کتاب کہا ہے اور وہاں کی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ کر کے جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار اور مقبرہ ہمایوں پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اگر یہ چیزیں دہلی میں نہ ہوں تو اس راجدھانی میں غیر ملکی مہمانوں کو اپنا شاندار ماضی دکھانے کے لیے کیا رہ جائے گا اور دنیاوی جاہ و جلال، آرٹ، فنون لطیفہ، فنِ تعمیر کی کون سی یادگار ہندوستان کی ترجمانی کر سکے گی"۔۲ے

سفر نامہ ناندیڑ-۱۹۶۳ء

سفر نامہ ناندیڑ میں وہاں کی اسلامی تاریخ، حضرت رفیع الدین قندھاری ناندیڑی کے حالات اور ماضی کی چند علمی و دینی خصوصیتوں کا تذکرہ اور وہاں کے موجودہ علمی و دینی صورتِ حال نادیدہ احباب، ماضی پر طائرانہ نگاہ، گردوارہ گرو گوبند سنگھ صاحب، سنگ تراشی کا شعبہ، آب رسانی کا محکمہ، دار العلوم کا جلسہ اور دینی تعلیمی کنونشن، اس دور میں دینی تعلیم کی اہمیت وغیرہ اس کے ذیلی عناوین ہیں۔

قاضی صاحب نے یہ سفر اجتماع کی غرض سے کیا تھا، مگر وہاں کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے اس کا جائزہ بھی لیا ہے اور اسے اپنے سفر نامہ میں شامل کر دیا۔

ایک خالص دینی سفر-۱۹۶۴ء

اس میں دائرۂ ثقافتِ اسلامیہ کی مجلسِ مشاورت، مولانا عطاللہ گھوسوی، شیخ نقشبند گھوسوی ثم لکھنوی سے ایک علمی ملاقات، جونپور کی ایک یادگار رات، جامع الشرق سلطان ابراہیم شاہ شرقی، ملک العلماء قاضی شہاب الدین جونپور کی سیر اور شاہی قلعہ کا تفصیلی ذکر موجود ہے اور شرقی دور کے بعض علماء وفضلاء کے بارے میں بتاتے ہوئے شرقی صورت کے حدود اور اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

مولانا قاضی صاحب نے جونپور کی اٹالہ مسجد میں "علمی تعلیمی اور دینی" موضوع

پر تقریر کی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا:

"جونپور اسلامی علوم فنون کی راجدھانی ہے۔ یہاں شاہان شرقیہ اور مغل بادشاہوں نے علم وفن کے تخت وتاج کی حکومت کی ہے۔ اگر شاہجہاں نے محبت کی حسین راتوں کی ٹھنڈی چاندنی کو سمیٹ کر آگرہ میں تاج محل تعمیر کیا ہے تو اسی نے ہندوستان کے اسلامی علوم کی بساط سے پورب کی بزم کو سجایا ہے اور "پورب شیراز ماست" کہہ کر اس سرزمین کو علم وفن، شعر وادب اور اسلامی رجال کا گہوارہ بنایا ہے، جہاں صدیوں تک علم وفن کے چراغ جلتے رہے اور اس کے گرد پروانے رونقِ محفل بنے رہے"۔ ۳۷

مولانا نے اس سفر میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی، ملک العلماء قاضی شہاب الدین اور حکیم محمد منظور انصاری کی زیارت کر کے ان کا تذکرہ کیا ہے اور اسی تذکرے میں حضرت دیوان عبدالرشید جونپوری، مولانا ہدایت اللہ خانصاحب، حضرت حمزہ چشتی اور مشرقی دور کے بعض علماء وفضلا بھی شامل ہیں اور آخر میں وہاں کے شاہی قلعہ، پل اور شہر کی مسجد اور مشرقی حکومت کے حدود واثرات پر تفصیلی معلومات مہیا کی ہیں۔

ممبئی سے برہان پور تک۔۱۹۶۵ء

قاضی صاحب نے ۱۹۶۵ء میں ممبئی سے برہان پور تک کا جو سفر کیا اس کے سفرنامہ میں برہان پور کے متعلق لکھتے ہیں کہ "خلیفہ عباسی ابو جعفر منصور نے بغداد کو دارالسلام کا لقب دیا تو ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہجہاں نے برہان پور کو دارالسرور کہہ کر پکارا ہے"۔

حقیقت میں یہ شہر برہان پور ہر اعتبار سے وسطِ ہند کا نشان آگیں فرحت بخش اور خوش کن شہر ہے۔ اس لیے اس کو اسی مناسبت سے یہ لقب دیا گیا۔ ویسے یہ شہر شیخ محمد بن محمود ہانسوی، شیخ برہان الدین کے نام پر شاہ نصیر خاں فاروقی نے ۸۰۱ھ میں آباد کیا تھا، تقریباً دو سوسال تک یہ شہر شاہان فاروقیہ کا پایہ تخت رہا اور اس کے بعد مغل بادشاہوں کے زیر تصرف آیا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے دور حکومت میں جنوبی ہند کی تمام سرگرمیوں کا مرکز رہا، اس دور میں عبدالرحیم خانِ خاناں نے یہاں پر تیس سال تک رہ کر اسے بڑی ترقی

دی اور دہلی ثانی کے مرتبہ کو پہنچایا۔ ۲۳ے

مولانا نے برہان پور کے تاریخی آثار و علائم کا بھی جائزہ لیا جس میں وہاں کا قلعہ جامع مسجد، مدرسہ فیض العلوم اور شاہان فاروقیہ کا قبرستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

برہان پور کے قلعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''شاہجہاں کی بیوی ممتاز محل کا انتقال اسی قلعہ میں زچگی کی حالت میں ہوا۔ اس وقت شاہجہاں ۱۰۴۰ھ میں خان جہاں لودھی کی سرکوبی کے لیے برہان پور میں تھا۔ ان ہی ایام میں سترہ ذی قعدہ کو ممتاز محل کے بطن سے بچی پیدا ہوئی اسی پیدائش میں ممتاز محل کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت وقتی طور پر اس کی لاش دریائے تاپتی کے مشرقی جانب زین آباد باغ میں آہوخانہ کے پاس دفن کی گئی۔ اس کے بعد وہ لاش آگرہ لاکر تاج محل کے قریب ایک چبوترہ پر دفن کی گئی اور جب تاج محل تیار ہوگیا تو اس میں مستقل طور سے رکھی گئی ۵۷ے یعنی تین بار ممتاز محل کی تدفین ہوئی۔

ممبئی سے بھٹکل تک-۱۹۶۷ء

بھٹکل کا سفر بھی علمی و دینی تھا، اس کا اصل مقصد جامعہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھنا تھا۔ اس میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی بھی ساتھ تھے۔

مولانا نے وہاں کی بہت سی معلومات کے ساتھ پردے کے رواج پر بھی ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ مسلمان عورتیں بغیر پردے کے باہر نہیں نکلتیں۔ وہاں کے لوگوں کا پیشہ عام طور سے تجارت اور کھیتی باڑی ہے۔ بھٹکل کی بستی کے باہر دکھن جانب ایک پہاڑ ہے جسے ''نماز کا پتھر'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ''جب عرب سے مسلمان تاجر و مبلغ یہاں آئے تو انھوں نے بندرگاہ کے اوپر پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی بعد میں لوگ اسی جگہ نماز پڑھتے رہے۔ اس کو گھیر دیا گیا ہے لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں تو وہاں نماز پڑھتے ہیں۔

۲۴ گھنٹے ماتھران میں-۱۹۶۹ء

ماتھران سے بمبئی ۶۷ میل دور ایک پہاڑی بستی ہے۔ یہ ضلع قلابہ کا ایک حصہ ہے اور سیر و تفریح کے لیے بہترین جگہ ہے۔ اکثر لوگ گرمیوں میں یہاں قیام کرتے ہیں۔
اس پورے سفر میں ماتھران کی تاریخ، محل وقوع، ریلوے لائن اور چٹانوں کا ذکر

ہے۔ آخر میں ''منزلِ مقصود'' کے عنوان پر یہ سفر ختم کیا گیا ہے۔

گجرات کا علمی سفر-۱۹۶۹ء

قاضی صاحب نے گجرات کا سفر اپنے دوستوں مولانا عبداللہ اسماعیل صاحب ناظم مدرسہ فلاح دارین ترکیسر، مفتی مولانا احمد ابراہیم بیمات اور مولانا تقی الدین صاحب ندوی مظاہری کے بے حد اصرار پر کیا تھا۔

ان لوگوں کا اصرار تھا کہ آپ وہاں جاکر تعلیمی سلسلے میں کچھ مشورہ دیں لیکن اس سفرنامے میں مشورہ کا ذکر موجود نہیں ہے۔ البتہ وہاں کے مدرسہ فلاح دارین کا ذکر اس کی خوبصورتی اور عظیم الشان عمارت کا تذکرہ ضرور ہے۔ وہاں کے مدرسہ فلاح دارین کی عمارت مثلث نما ہے، جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے مشہور ہے۔

مولانا نے ترکیسر کے مدرسہ فلاح دارین کی خصوصیات کے ساتھ اس کے کتب خانے کی بھی خوبی بیان کی ہے۔ لکھا ہے کہ ''وہ کتب خانہ نیا ضرور ہے، مولانا عبداللہ صاحب کے علمی ذوق اور حسنِ انتظام کی وجہ سے بہت شاندار ہے۔ اس میں نادر و نایاب کتابوں اور مصر و شام کے علاوہ دیگر ممالک کی عربی اور اسلامی مطبوعات بھی موجود ہے۔

احمد نگر کا علمی و دینی سفر-۱۹۶۹ء

احمد نگر دکن کے مرکزوں میں سے ہے۔ چاند سلطانہ احمد نگر کے حکمراں خاندان کی بہادر بیٹی تھیں۔ جس کی شجاعت و بہادری نے احمد نگر کو ایک شاندار تاریخ دی ہے۔ وہاں کا چاند سلطانہ ہائی اسکول اس بہادر خاتون کی یاد تازہ کر رہا ہے۔[۶۷]

نویں اور دسویں صدی سے احمد نگر بھی جنوب کے دیگر مسلم علاقوں اور مرکزوں کی طرح اربابِ علم و فن اور اہلِ فضل و کمال کا گہوارہ رہا ہے۔ مولانا پیر محمد شیروانی احمد نگر کے علماءِ کبار میں سے تھے۔ جن کا تذکرہ مولانا نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

قاضی صاحب نے احمد نگر کے مشہور تاریخی مقامات میں قلعہ احمد نگر، بہشتی باغ، فرح باغ، روضہ باغ اور کوٹلہ وغیرہ کو شمار کیا ہے اور خانقاہ عالمگیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:
''شہنشاہ محمد اورنگ زیب عالمگیر اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہاں آئے تو فرمایا: ''احمد نگر مقامِ اختتام است'' یعنی ہمارے سفرِ زندگی کی آخری منزل احمد نگر ہے اور ایسا ہی

ہوا احمد نگر میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ مغسل کے نام سے یہ مقام مسجد اور بارہ دری کے وسط میں حوض کے سامنے موجود ہے۔

کوکن کا علمی سفر

قاضی صاحب نے ۱۴ رمئی سے ۱۷ رمئی تک کوکن کا سفر کیا۔ اس سفر میں وہ مدرسہ حسینیہ کوکن کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''قلابہ اور رتناگری کے ساحلی و جبالی علاقہ کوکن کہلاتا ہے''۔ ۷۷

اس کی لمبائی شمال سے جنوب تک اور چوڑائی مغرب سے مشرق تک واقع ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر عرب نسل کے مسلمان آباد ہیں۔ ان کے آباء و اجداد بغرض تجارت یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ہند و عرب کے سواحل پر ان کی تجارتی سرگرمیاں جاری تھیں اور آخری دور میں پرتگیزیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کر کے یہاں کے باشندوں سے تجارت چھین لی تھی اور بڑا ظلم کیا۔

مشہور ہے کہ کوکن کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہاں دنیوی تعلیم کی کثرت تھی مگر کوئی حافظِ قرآن نہیں تھا مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے سات شعبان ۱۳۸۸ھ کو شری وردھن علاقے کی ایک مسجد میں مدرسہ حفظ قرآن کا افتتاح کیا اور بچوں نے داخلہ لیا۔ تقریباً تین، چار سال گذرنے کے بعد وہاں سے حافظ پیدا ہوئے جس سے لوگوں کے حوصلے بلند ہوئے اور مزید تعلیم کی اہمیت پیدا ہوئی۔

غازی پور کا سفر-۱۹۷۴ء

مولانا قاضی صاحب نے دو دن اس دیار میں گذارے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ غازی پور کے ماضی کا بھی تفصیلی تذکرہ اور وہاں کے علماء، مشائخ، مدارس کا ذکر کرتے ہوئے مدرسۃ المساکین کا ذکر بڑے انشراح سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''مدرسۃ المساکین بہادر گنج کا سب سے پرانا مدرسہ ہے۔ اس مدرسے سے کئی علماء یہاں پیدا ہوئے۔ اس مدرسے کا نام ''مدرسۃ المساکین'' مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے رکھا''۔ ۷۸

مدرسہ دینیہ کے تنظیمی جلسہ میں قاضی صاحب نے صدارتی تقریر کی جس میں زیادہ تر باتیں سیکولر، قومیت اور حکومت کی طرف سے خطرات کے اظہار پر مبنی تھیں۔

بارہ دن جنوبی ہند میں-۱۹۷۵ء

۱۹۷۵ء میں تقریباً ۲۲، ۲۳ فروری کو مولانا آل انڈیا بورڈ کے اجلاس میں تشریف لے گئے۔ جس میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی بحیثیت ارکان شریک تھے۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے بنگلور اور سرنگا پٹنم کا سفر کیا نیز ٹیپو سلطان کے مزار پر بھی گئے اور جامعہ سبیل الرشاد کا دورہ کیا۔ جس میں انھوں نے شہر بنگلور کے لال باغ کی خوبصورتی، وہاں کے مسلمانوں کی اخلاقی خوبیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

مولانا نے مدارس کے کتب خانہ محمد یہ کے بارے میں دلچسپ معلومات دی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

> ''یہ کتب خانہ مخطوطات و نوادرات کے بارے میں ہندوستان ہی میں نہیں دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً چار سو سال ہے۔ قلمی اور نادر کتابوں کے علاوہ دیگر نوادرات بھی موجود ہیں خاص طور سے نوابانِ کرناٹک اور سلطان ٹیپو سے متعلق بہت سے فرامین اور تحریریں یہاں پائی جاتی ہیں۔ نیز بادشاہوں و امراء کے سکّے اور بعض استعمالی سامان موجود ہیں''۔ ۷۹

مہاراشٹر سے سوراشٹر تک-۱۹۷۸ء

مولانا کا یہ ایک علمی و تاریخی سفر تھا جو انھوں نے جون ۱۹۷۹ء میں کیا اور سندھ، گجرات میں مسلمان فاتحین اور کاٹھیاواڑ کے ساحلی علاقوں کا ذکر کر کے فاتح ہند سلطان محمود غزنوی کی فتوحات اور سومناتھ مندر کے مسلسل حملوں کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔

شہر جونا گڈھ کے متعلق بتایا ہے کہ یہ شہر تاریخی ہے اور ایک زمانہ تک اسلامی روایات و مسلم اقتدار کا مرکز رہ چکا ہے۔ شہر جونا گڈھ کی تفصیل کے ساتھ اس کے اسلامی نام کا بھی ذکر کیا ۔لکھا ہے کہ جونا گڈھ کا اسلامی نام مصطفیٰ آباد ہے۔ اس کی کل آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی کم ہے اور ان کا معاشی و دینی حال نہایت ابتر ہے۔ ۸۰

غیر مطبوعہ تصانیف

مولانا قاضی صاحب کی بعض وہ تصانیف جن پر انھوں نے بڑی محنت کی مگر ان تصانیف کو وجود پیرہن نہ مل سکا ذیل کی فہرست میں ان تصانیف کے نام مذکور ہیں۔

(۱) کتب اور کتب خانے (اردو)

(۲) مقالات قاضی اطہر (اردو)

(۳) مسئلہ خلق قرآن کی سیاسی حیثیت (اردو)

(۴) نسخۂ شفاء (اردو)

(۵) الخطبات والرسائل العربیۃ (عربی)

(۶) سوانح امام جوزی (اردو)

(۷) حیات لیث بن سعد (اردو)

گم شدہ تصانیف

قاضی صاحب کی چند اہم تصانیف جو غائب ہوگئیں۔ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) اصحاب صفہ

قاضی صاحب کی یہ کتاب منظوم تھی، جو شاہنامہ اسلام کے طرز پر لکھی گئی تھی۔ موصوف کی یہ کتاب بھی غائب ہوگئی۔

(۲) منتخب التفاسیر

مولانا نے قیام لاہور کے دوران ایک کتاب لکھی جس کا نام منتخب التفاسیر رکھا۔اس میں انھوں نے سات تفسیروں کا خلاصہ بقدر ضرورت کہیں مجملاً اور کہیں مفصلاً کیا تھا۔اس میں اشرف علی تھانوی کی حمائل شریف، بیان القرآن، تفسیر حقانی، تفسیر ثنائی، ترجمان القرآن، تفہیم القرآن اور تفسیر ماجدی کے مطبوعہ حصے تھے۔

موصوف نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء سے یکم جون ۱۹۴۶ء تک یعنی کل سولہ مہینوں میں اس کام کو مکمل کیا پوری تفسیر ۹۵۰ صفحات پر مشتمل تھی۔تقریباً تیرہ پاروں تک کتابت بھی ہو چکی تھی اس کے کاتب منشی محمد قاسم لدھیانوی کے پوتے تھے مگر افسوس کہ اتنی اہم تالیف تقسیم ملک کے ہنگامے کی نذر ہوگئی۔

حوالے

۱۔ نورالحسن راشد کاندھلوی، ماہنامہ ضیاء الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ، قاضی اطہر نمبر، ص ۱۸۰، اگست ۲۰۰۳ء

۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، خلافت عباسیہ اور ہندوستان ''مقدمہ'' تنظیم فکر ونظر، سندھ، ص ۳۲، اپریل ۱۹۸۶ء

۳۔ قاضی اطہر مبارک پوری، اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، ندوۃ المصنفین دہلی، ص ۱۰۷، ۱۹۶۹ء

۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق جدید لکھنؤ، ۲؍جنوری ۱۹۷۰ء

۵۔ ایضاً، ۱۶؍جنوری ۱۹۷۰ء

۶۔ قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، رحیمی پریس اصطبل اسٹریٹ بمبئی، ص ۱۰-۱۱، جون ۱۹۷۴ء

۷۔ ایضاً، ص ۵

۸۔ قمر الزماں مبارک پوری، مئے طہور، ص ۱۰۱، ۲۰۰۶ء

۹۔ قاضی اطہر مبارک پوری، آثار واخبار، ص ۱۰۷، ۱۹۸۸ء،

۱۰۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات، فرید بکڈپو، دہلی، ص ۹۸، ۲۰۰۳ء

۱۱۔ قاضی اطہر مبارک پوری، بناتِ اسلام کی علمی و دینی خدمات، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی، ص ۲۸، ۲۰۰۶ء

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خودنوشت سوانح)، فرید بک ڈپو، ص ۱۱۷، دہلی ۲۰۰۳ء

۱۵۔ قاضی اطہر مبارک پوری، مسلمان، ''اظہار تشکر''، سلمان بشر صاحب، قاسم آباد، انجان شہید اعظم گڑھ، ص ۷، ۲۰۰۶ء

۱۶۔ ایضاً، ''مقدمہ''، ص ۱۲

۱۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات (خودنوشت سوانح)، فرید بکڈپو، دہلی، ص ۹۵، ۲۰۰۳ء
۱۸۔ قاضی اطہر مبارک پوری، اسلامی شادی، ''دیباچہ'' فرید بکڈپو، دہلی، ص ۲۰، ۲۰۰۵ء
۱۹۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق جدید، لکھنؤ، ۹ر نومبر ۱۹۵۶ء
۲۰۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، برہان، ستمبر ۱۹۶۰ء
۲۱۔ قاضی اطہر مبارک پوری، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، دائرہ ملیہ مبارک پور، ص ۱۹، ۱۹۸۷ء
۲۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، علماء اسلام کی خونیں داستانیں، رانی پورہ، مبارک پور، مئو، ص ۱۰۴، ۲۰۰۸ء
۲۳۔ اسیر ادروی، ترجمان الاسلام، بنارس (قاضی اطہر نمبر)، آئینہ در آئینہ، ص ۱۶۵، ۱۹۹۶ء
۲۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق جدید، لکھنؤ، ۱۴ر جنوری ۱۹۷۴ء
۲۵۔ مولانا انظر شاہ کشمیری، ''رسالہ'' دارالعلوم دیوبند، ۱۹۷۰ء
۲۶۔ قاضی اطہر مبارک پوری، مکتوبات امام احمد بن حنبل، مکتبۃ الفہیم، مئو، ص ۱۹، ۲۰۰۶ء
۲۷۔ سورہ توبہ، آیت نمبر ۶، پارہ ۲۲
۲۸۔ قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہدِ رسالت میں، فرید بکڈپو، نئی دہلی، طبع اول جدید ایڈیشن، ص ۱۳-۱۴، ۲۰۰۴ء
۲۹۔ ایضاً، ص ۳۸
۳۰۔ قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہد رسالت میں، ص ۶۴، ۲۰۰۴ء
۳۱۔ قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہد رسالت میں، ص ۶۷
۳۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہد رسالت میں، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ص ۱۲۳، ۲۰۰۴ء
۳۳۔ ایضاً، ص ۱۲۵
۳۴۔ سنن نسائی، باب غزوۃ الہند، ثم عرب و ہند عہد رسالت میں، فرید بکڈپو، نئی دہلی
۳۵۔ قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہد رسالت میں، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ص ۱۵۷، ۲۰۰۴ء

* موتراشی کا مطلب جاٹوں کی طرح بال ترشوانا ہے۔ جاٹ لوگ اپنے بالوں کو صلیب کی شکل میں ترشواتے تھے۔

۳۶ اسیر ادروی، زبانی معلومات، دسمبر ۲۰۰۷ء
۳۷ قاضی اطہر مبارک پوری، تدوین سیر مغازی، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ص ۱۸، ۲۰۰۴ء
۳۸ ایضاً، ص ۲۹۳-۲۹۴
۳۹ ایضاً، مقدمہ، ص ۱۱
۴۰ قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علماء، جمال پرنٹنگ پریس، نئی دہلی، ص ۲۱، ۱۹۷۹ء
۴۱ ایضاً، ص ۴۰
۴۲ مولانا نظام الدین بن مقیم سہروی، طبقات الکبریٰ، ص ۱۳۶، دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۴۰-۴۱
۴۳ قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۷۴-۷۵، ۱۹۷۹ء
۴۴ ایضاً، ص ۸۰
۴۵ ایضاً، ص ۸۳
۴۶ سید سلیمان ندوی، مقدمہ حیات شبلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ص ۵۷، ۱۹۷۰ء
۴۷ قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۱۰۳، ۱۹۷۹ء
۴۸ قاضی اطہر مبارک پوری، رجال السند والہند، ص ۲۵۳-۲۵۴، مطبع ادارہ البلاغ، ۱۹۵۸ء
۴۹ ایضاً، ص ۴۹
۵۰ ایضاً، ص ۵۴
۵۱ مولانا اسیر ادروی، ترجمان الاسلام، بنارس (قاضی اطہر نمبر)، ص ۲۲، ۱۹۹۶ء
۵۲ کاروانِ حیات، (خودنوشت سوانح)، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ص ۱۱۲، ۲۰۰۳ء
۵۳ مولانا اعجاز، ماہنامہ ضیاء الاسلام، شیخوپور، (نقوش وتاثرات)، ص ۲۴۸
۵۴ شیخ عبد العالی عقباوی، ترجمان الاسلام، بنارس (قاضی اطہر نمبر)، آئینہ در آئینہ، ص ۱۲۵
۵۵ عبد الماجد دریابادی، صدق جدید، ۱۲ر جون ۱۹۵۹ء
۵۶ یہ خط قاضی سلمان مبشر (قاضی صاحب کے فرزند) سے ۱۸ را کتوبر ۲۰۰۷ء کو حاصل ہوا۔

۵۷ے قاضی اطہر مبارک پوری، رجال السند والہند، ادارہ البلاغ، جمال پرنٹنگ پریس نئی دہلی، ص۹،۱۹۷۹ء
۵۸ے قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات مع قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ص۷۸
۵۹ے قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص۲۱،۲۲،۱۹۶۹ء
۶۰ے قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مطبع ندوۃ المصنفین دہلی، ص۲۱-۲۲،۱۹۶۷ء
۶۱ے ایضاً، ص۳۳
۶۲ے ایضاً، ص۷۷-۷۸
۶۳ے ایضاً، ص۹۹
۶۴ے ایضاً، ص۱۲۰
۶۵ے احسن التقالیم، ص۳۷،ثم ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص۱۲۰
۶۶ے ایضاً، ص۱۷۰
۶۷ے ایضاً، ص۱۸۳
۶۸ے ایضاً، ص۱۹۳
۶۹ے ایضاً، ص۲۵۸
۷۰ے ایضاً، ص۲۶۴-۲۶۵
۷۱ے ایضاً، ص۲۶۸
۷۲ے ضیاء الحق خیرآبادی (مرتب)، قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے، کاکوری آفسیٹ لکھنؤ، ص۱۰۵،۲۰۰۵ء
۷۳ے ایضاً، ص۱۴۰
۷۴ے ایضاً، ص۱۵۸
۷۵ے ایضاً، ص۱۶۵
۷۶ے ایضاً، ص۲۰۸-۲۰۹
۷۷ے ایضاً، ص۲۲۰
۷۸ے ایضاً، ص۲۳۹
۷۹ے ایضاً، ص۲۵۵
۸۰ے ایضاً، ص۲۶۳

☆☆☆
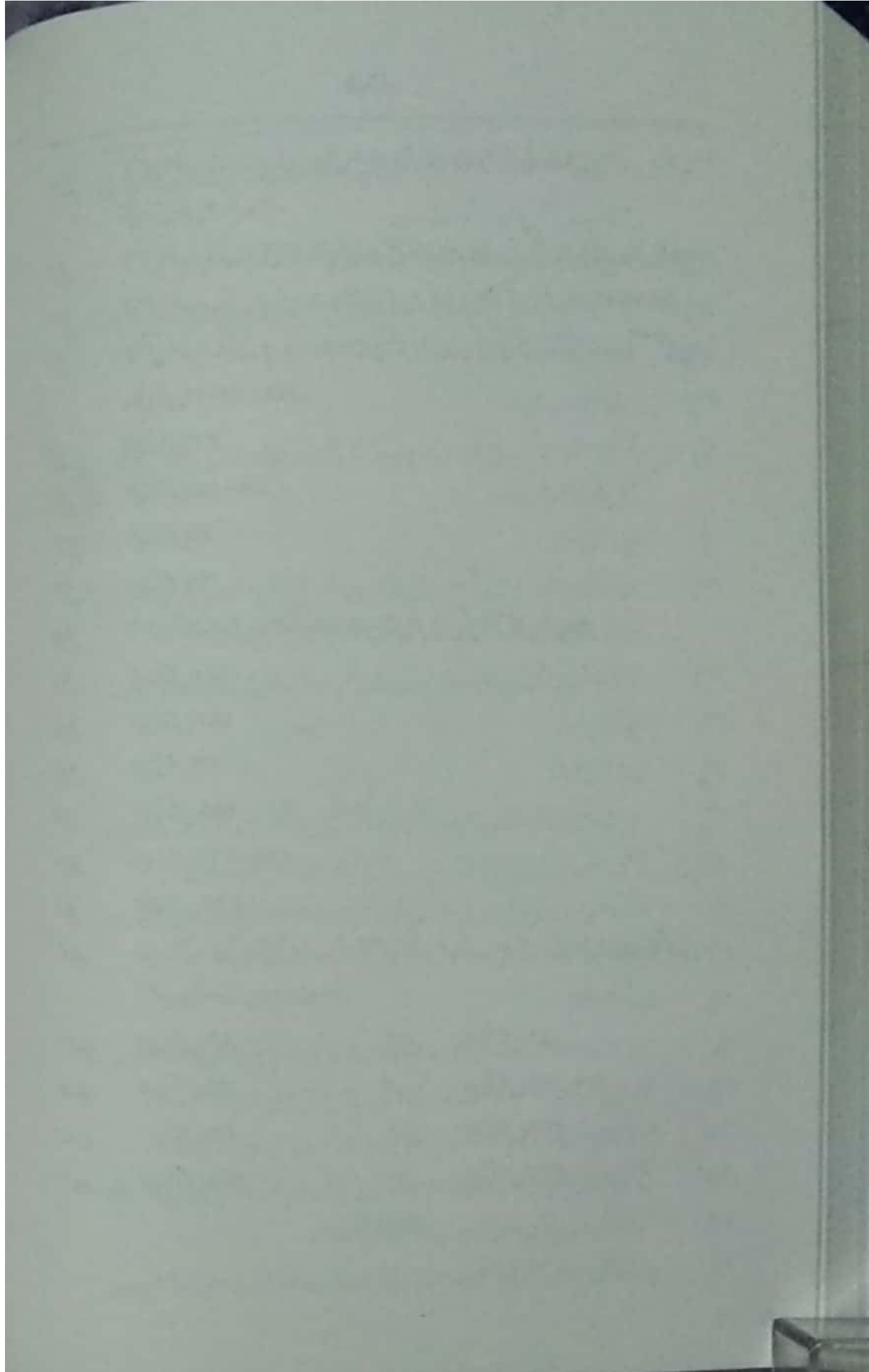
باب چہارم

صحافت

قاضی اطہر مبارک پوری کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ صحافت ہے۔ اس دوران انھوں نے زندگی کے چالیس سال یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء کا دور صحافت کی مصروفیات میں گذارا اور ساتھ ہی ساتھ تصنیفی وتدریسی سرگرمیاں بھی مسلسل جاری رکھیں۔

یوں تو صحافت معاش کا بہترین ذریعہ ہے، اس کے ذریعے مختلف قسم کی معلومات عوام کو فراہم کی جاتی ہیں اسی معلومات کو عرف عام میں ''اخبار'' کہا جاتا ہے، جو تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان کی ایک ناگزیر ضرورت بھی بن گیا ہے۔

اخبار لوگوں کے اظہار خیال کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اسی کے ذریعے ہر قوم کی سیاسی اور معاشی حالت نیز اس کے فکری اور عملی رجحانات کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اخبار انسان کے خیالات ور جحانات، جذبات ومیلانات میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور مختلف قوموں کے درمیان یکجہتی پیدا کرنے میں بہترین معاون ومددگار بھی ثابت ہوتے ہیں۔ آج کل صحافت کی سیاسی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی کے ذریعے رائیں ہموار کی جاتی ہیں، کیونکہ جو کام اخبار انجام دیتا ہے وہ کسی وزیر یا تدبیر سے ممکن نہیں۔ بقول مولانا حالی:

''اخبار نویس قوم کا ناصح، ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہوتا ہے'' [۱]

قاضی صاحب جب فنِ صحافت سے منسلک ہوئے تو اس وقت یہ فن بہت عام ہو چکا تھا، مگر پھر بھی ان کے صحافت کے استاد مولانا عثمان فارقلیط صاحب نے بطور مربّی ان سے کہا کہ ''آپ عالم ہیں اس لیے صحافت کو پیشہ مت بنائیے گا، کیونکہ یہ پیشہ طوائفوں کا ہے، جیسے حالات اور جیسی پالیسی ہوتی ہے ویسا ہی تقاضا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ضمیر پر دباؤ پڑتا ہے۔ البتہ عوام وخواص میں تعارف کے لیے کچھ دنوں تک یہ کام کیجیے'' [۲]

مولانا قاضی صاحب بھی صحافتی زندگی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں تو خاص طور سے اپنی تدریسی وتصنیفی دنیا زیادہ محبوب تھی۔ مگر اہل وعیال کی کفالت اور معاشی تنگی کی وجہ سے صحافتی زندگی سے منسلک ہونا پڑا۔ [۳]

وہ خود لکھتے ہیں کہ:

''بمبئی میں تلاش معاش کی غرض سے آیا تھا اور اپنی علمی حیثیت کو بچانا چاہتا تھا، اس لیے صحافت اور اخبار نویسی کو میں نے علمی اور دینی

مشغلہ کے طور پر اختیار کیا اور پیشہ ور صحافی بننا کبھی پسند نہیں کیا''۔ ؎

قاضی صاحب ایک فرض شناس، دیانت دار اور کامیاب صحافی ثابت ہوئے اور لوگوں میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ایک کامیاب صحافی میں ہونا چاہیے۔ وہ صرف ایک ہی اخبار نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد سے بھی منسلک رہے۔

آئندہ سطور میں میدانِ صحافت میں قاضی صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۱) مرکز تنظیم اہلِ سنت والجماعت (امرتسر)

۱۹۴۴ء میں مولانا امرتسر کے ادارہ ''مرکز تنظیم اہل سنت والجماعت'' سے وابستہ ہوئے اور تیس روپیہ فی مہینہ کے حساب سے کام کرنا شروع کیا۔ اس میں قاضی صاحب سید نورالحسن بخاری کا مضمون نگاری میں تعاون کرتے تھے اور شیعوں و قادیانیوں کے رد میں ایک صفحے کا مضمون بھی لکھتے تھے۔

اس تنظیم (مرکز تنظیم اہل سنت والجماعت) کے روحِ رواں مولانا سید نورالحسن بخاری تھے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور ملتان کے رہنے والے تھے۔ قاضی صاحب نے انہی کی نگرانی میں کام کرنا شروع کیا۔ مگر امرتسر کا قیام مولانا کو پسند نہیں آیا کیونکہ وہاں کے ماحول سے کوئی خاص انسیت پیدا نہیں ہوئی اور پنجابی لب ولہجہ بھی مولانا کو پسند نہیں آیا، زبان کی دشواری بھی لاحق تھی، جو علمی کام میں مانع ہوتی تھی، اس وجہ سے مولانا امرتسر کو چھوڑ کر لاہور آ گئے اور وہاں روزنامہ ''زمزم'' میں کالم نگار کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ ؏

''اخبار زمزم'' (لاہور)

جنوری ۱۹۴۷ء سے قاضی صاحب نے اخبار ''زمزم'' میں کام کرنا شروع کیا ''زمزم'' ایک سہ روزہ اخبار تھا، لیکن ۱۹۴۷ء سے اسے روزنامے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس میں قاضی صاحب نے نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، ابتداء میں انھیں بڑی پریشانی ہوئی لیکن مولانا فارقلیط صاحب کے تعاون سے یہ پریشانی دور ہو گئی۔ مولانا فارقلیط ان کی تحریروں میں ترمیم و تبدیلی کر دیا کرتے تھے، جس سے دھیرے دھیرے ان میں خوداعتمادی پیدا ہو گئی۔ اور وہ بڑے پیمانے پر لکھنے لگے۔

اس روزنامے میں قاضی صاحب کے دوسیاسی نوٹ اور ایک مختصر اخلاقی و دینی مضمون ہوتا تھا اور مختلف عنوان پر مشتمل ایک آرٹیکل بھی ہوتا تھا۔ اور لاہور جانے سے پہلے اور اس کو چھوڑنے تک اسی اخبار میں ان کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔

قاضی صاحب نے ۲۸ جنوری ۱۹۴۷ء میں مولانا فارقلیط کی زیرنگرانی کام کرنا شروع کیا تو اس وقت تقسیمِ ملک کا مسئلہ عروج پر تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں سخت اختلافات تھے، ملک میں فسادات کا طوفان جاری تھا، اخلاق وانسانیت ختم ہورہی تھی۔ انہی احوال کی مناسبت سے قاضی صاحب اخلاقی و دینی مضامین لکھتے تھے۔[۶]

ان بحرانی حالات میں "زمزم" ایک نیشنلسٹ اخبار تھا اور اس کی پالیسی مسلم لیگ کے خلاف تھی، ایسے حالات میں مولانا نے سیاسی مضامین لکھے اور ان کو جمع کرکے "اسلامی نظامِ زندگی" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔

اس سے قبل بھی وہ ۱۹۴۵ء میں اس اخبار سے منسلک تھے۔ اس وقت انھوں نے جو مضامین لکھے وہ بھی خاصے اہم اور مفید تھے۔ ان کا ایک مضمون "جزائر شرق الہند کے تاریخی حالات" کے عنوان سے تھا، جس سے متعلق مسلم یونیورسٹی میں ساٹرا کے ایک طالب علم نے قاضی صاحب کو خط لکھا اور مزید تحقیق چاہی۔

"اخبار انصار" (بہرائچ)

۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء تک بہرائچ میں رہ کر اخبار "انصار" جاری کیا۔ قاضی صاحب نے یہ کام مولانا محفوظ الرحمٰن نامی (یوپی کی پہلی کانگریس حکومت کے پارلیمنٹری سکریٹری تھے) کے زیرنگرانی کیا۔ اس وقت ان کی تنخواہ ۷۵ روپے تھی۔ جس دور میں انھوں نے اخبار "انصار" میں کام شروع کیا وہ زمانہ شمالی ہند خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کے لیے بڑا پرآشوب تھا۔ قتل وغارت گری، آتش زنی اور دوسرے طرح طرح کے فسادات تھے، غرض یہ کہ شدید قسم کی فرقہ پرستی کا دور تھا۔

مگر مولانا اس پرخطر دور میں بھی فرقہ پرستوں، قاتلوں اور مسلمان دشمن جماعتوں کے خلاف تیز وتند انداز میں لکھا کرتے تھے۔ ان کی تحریر کے خلاف یوپی حکومت کی طرف سے کئی بار تنبیہ اور نوٹس آیا مگر ان پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

آخر کار یوپی حکومت کا ایک سرکلر تمام عدالتوں میں پہنچا کہ اخبار "انصار" کو کوئی

اشتہار نہ دیا جائے۔ وہ حکومت کے نزدیک ایک غیر مقبول اخبار ہے، لیکن مولانا نامؔی نے حکومت کو اطمینان دلایا کہ وہ اس اخبار پر کنٹرول کریں گے اور انھوں نے اپنے کہنے کے مطابق کافی کنٹرول بھی کیا۔ کیونکہ اس وقت یعنی ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا قتل ہوا تھا، اس لیے حالات کی نزاکت کے تحت کنٹرول کرنا ہی بہتر تھا، لہٰذا چھ سات مہینے کے بعد اس اخبار کو بند کر دیا گیا۔ حالانکہ اخبار انصار کا مقصد ہر ایمان دار کو دین کا مددگار بننے کی دعوت دینا اور مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کرنا تھا تاکہ وہ اپنا باعزت مقام حاصل کر سکے اور پیشہ ور جماعتوں کی ضروریات سے حکومت وقت کو باخبر کرنا اور ان کے واجبی حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کرنا۔ پس ماندہ جماعتوں کو ان کے حقوق و فرائض سے باخبر کرنا، غریب مزدور، کاشت کار اور پیشہ ور اقوام کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی اصلاح و ترقی کے لیے کوشش کرنا تھا۔[۷]

قاضی صاحب نے بہرائچ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں خواجہ محمد خلیل (اسمبلی کے ممبر اور درگاہ سالار مسعود غازی کی کمیٹی کے چیرمین) کے ساتھ کافی تفریح کرتے تھے۔ مچھلیوں کا شکار بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ابن بطوطہ نے وہاں بانس کے جنگلوں اور گینڈے کا ذکر کیا ہے، درگاہ کے قریب بانسوں کا جنگل تھا، اس سے ایک چھڑی کاٹی اور وہاں کے ایک معمولی سے کتب خانہ میں ابوالعلاء معری کا دیوان ''سقط الزند'' تھا اسے ڈھائی روپیے میں خریدا، جو ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں مصر میں چھپا ہے۔[۸]

قیام بہرائچ کے دوران ہی ''تذکرہ مشاہیر اعظم گڑھ و مبارک پور'' کے عنوان سے کتاب لکھنے کی ابتداء کی۔ لیکن جب مسوّدہ تیار ہو گیا تو اسی سے ''تذکرہ علماء مبارک پور'' ۱۹۷۴ء میں شائع کی۔

''جمہوریت'' بمبئی

۱۵ر جون ۱۹۵۰ء میں نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے اخبار ''جمہوریت'' میں کام کیا، اس وقت ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اب پہلے کے بالمقابل ایک سو چالیس روپیہ آمدنی تھی۔

اخبار ''جمہوریت'' ایک روزنامہ تھا، اس میں ''افکار و مطالعات'' کے عنوان سے علمی، تاریخی اور سیاسی کالم ہوتے تھے اور درمیان میں ''قرآنی جواہر پارے'' کے عنوان سے ایک آیت کی تشریح ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مختلف عنوانات پر مشتمل طویل مضامین جو ملی و تاریخی اور سیاسی موضوعات پر ہوتے تھے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں بھی اس میں شائع

ہوتیں تھیں۔اس کے علاوہ مراسلات کی کاٹ چھانٹ اور پریس کے لیے کاپی جوڑنا بھی مولانا کی ہی ذمہ داری تھی۔

چنانچہ دیگر اخبارات کے مقابلے میں ''جمہوریت'' کو کافی شہرت حاصل ہوئی، جس کی وجہ سے دوسرے اخبار کافی متاثر ہوئے، یعنی ان کی مقبولیت کم ہوگئی، خاص طور سے روزنامہ ''انقلاب'' زیادہ متاثر ہوا۔اس کے مالک جناب عبدالحمید انصاری سخت پریشانی میں پڑگئے، عالموں سے ''انقلاب'' میں دینی و اخلاقی مضامین نقل کروانے لگے نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں اخبار ''جمہوریت'' اور ''انقلاب'' ایک دوسرے کے حریف بن گئے ، یہ بات صحافیوں اور اخبار بینوں کے لیے ایک دلچسپ وقتی مشغلہ بن گئی لیکن مولانا اطہر کے لیے پریشانی کا باعث کیونکہ اتنے طول طویل مضامین لکھنے کے باوجود بھی ان کا نام کہیں نہیں ہوتا تھا۔اس لیے چھ سات مہینوں کے بعد ہی مولانا حامد الانصاری غازی کی وجہ سے پریشان ہوگئے، اور انھوں نے اس روزنامے (جمہوریت) میں کام کرنا بند کردیا اور اخبار ''انقلاب'' سے منسلک ہوگئے۔

''انقلاب'' (ممبئی)

۲۳؍فروری ۱۹۵۱ء کو مولانا مبارک پوری ''جمہوریت'' کو چھوڑ کر اخبار ''انقلاب'' سے وابستہ ہوگئے جس سے سید حامد الانصاری غازی کافی ناراض ہوئے، مگر قاضی صاحب کو ان کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی، انھوں نے دوسرے دن سے ہی ''انقلاب'' میں وہی کالم لکھنے شروع کیے جو ''جمہوریت'' میں لکھتے تھے، مگر عنوان میں ردّ و بدل کردیا۔یعنی جمہوریت میں ''قرآنی جواہر پارے'' کے عنوان سے لکھتے تھے، اس کو بدل کر ''جواہر القرآن'' کردیا اور ''افکار و مطالعات'' کی جگہ ''احوال و معارف'' عنوان کردیا۔لیکن مضامین اسی طرح کے دینی اور سیاسی ہی ہوتے تھے اور احادیث اور بزرگانِ دین کے واقعات اصلاحی انداز میں لکھتے تھے اس میں عالم اسلام کے حالات اور اس پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔فقہی و دینی مسائل کے جوابات بھی لکھتے تھے۔الغرض یہ کہ احوال معارف کا کالم ہر قسم کی معلومات کا خزانہ ہوتا تھا۔اس اخبار میں قاضی صاحب کی غزلیں اور نظمیں بھی ہوتی تھی۔ہر خاص و عام بھی بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔

''انقلاب'' کی مقبولیت احوال و معارف کے کالموں کی وجہ سے زیادہ تھی، بہت

سے اہل علم پڑھنے کے بعد اس کالم کے تراشے کاٹ کر رکھ لیتے تھے، جس سے بعد میں استفادہ کرتے اور انھیں بہت سی علمی و دینی معلومات حاصل ہوتیں۔ الغرض یہ کہ اخبار ''انقلاب'' جو ''جمہوریت'' کی وجہ سے اپنی مقبولیت کھو چکا تھا دوبارہ اپنے مقام پر پہنچ گیا۔

اس اخبار میں قاضی صاحب نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۱ء تک یعنی چالیس سال تک کام کر کے۔ اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ اس میں صرف کیا۔ اخبار ''انقلاب'' کے ''جواہر القرآن'' میں پہلے ایک آیت کا ترجمہ ہوتا تھا۔ یہاں اس باب میں چند آیات کا ترجمہ اور تشریح بطور مثال پیش ہے۔ مثلاً سورۂ نساء کی یہ آیت کہ:

''إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا'' (النساء:۹)

(یقیناً جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ کھاتے ہیں اور عن قریب وہ آگ میں جلیں گے۔)

اس آیت کی تشریح ان لفظوں میں کی ہے کہ یتیم معاشرہ کی ایک مقدس امانت ہے، جسے مرجانے والے قوم کو سونپ جاتے ہیں۔ اس امانت میں خیانت کرنا عظیم جرم ہے اور ایسے مجرموں کے لیے سخت وعید آئی ہے اس امانت کی خیانت یہ ہے کہ قوم کے لوگ یتیموں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ دیں، ان کی دیکھ بھال سے لاپروائی برتیں، ان کے حقوق میں کمی کریں، پھر سب سے بڑے گنہ گار وہ لوگ ہیں، جو ان معصوموں کا مال کھاتے ہیں اور ان کی رہی سہی پونجی کو ہضم کرنے میں ذرا بھی شرم و حجاب محسوس نہیں کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ کھانا نہیں بلکہ اپنے شکم میں آگ کھا رہے ہیں اور شکم کی جہنم کو یتیموں کے مال کی دہکتی ہوئی آگ سے پُر کر رہے ہیں۔ اپنے پڑوس کے یتیموں کی دولت میں خرد برد کرتے ہیں، خوب یاد رکھو ویسے تو کسی کا مال بغیر حق کے کھانا بدترین جرم ہے، مگر یتیم کے مال کو کھانے والے بڑے گنہ گار ہوتے ہیں، ان کو بڑی عبرت ناک سزا ملے گی۔ ۱۰

اسی طرح سے سورہ ''المؤمن'' کی ایک آیت کا ترجمہ کر کے پچھلی قوموں کے انجام سے باخبر کیا ہے۔

وہ آیت یہ ہے:

''أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ" (سورۂ مومن: ۲۱)

(کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں، دیکھا کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے زیادہ طاقت ور اور زمین و مکان والے تھے۔ پس پکڑ لیا اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے بدلے اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔)

اس آیت کی تشریح بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ: ''اس کائنات میں سینکڑوں قومیں پیدا ہوئیں اور اپنی مدت پوری کر کے دنیا سے فنا ہو گئیں اور آج ان کے آثار و علائم اور نشان تک نہیں ملتے اور بہت سی قوموں کے نشان اور آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تہذیب و تمدن اور ان کی ثقافت ہمارے زمانہ سے کہیں بلند تھی جن کا اندازہ آج بھی ان کے تعمیری نشان اور تاریخی حالات سے ہوتا ہے۔ انھوں نے پہاڑوں کے سینوں کو چاک کر کے اپنی یادگاریں بنائیں۔ دریاؤں کا رخ پھیر کر اپنی طاقت دکھائی، سنگین عمارتوں کو بنا کر اس صفحۂ ہستی پر اپنا نام روشن کیا اور آج کی متمدن حکومتیں ان کے ان باقی ماندہ آثار پر فخر کرتی ہیں اور ان کو ملکی اور قومی ورثہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں، مگر ان گذشتہ قوموں کا انجام کیا ہوا؟ اور دنیا سے وہ کس عبرت ناک طریقہ پر ختم ہوئیں اس کا کسی قوم اور کسی فرد کو خیال نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان کے آثار و نشان سے ہی سبق لینا چاہیے اور یہی چیز انسان کے لیے مفید ہے''۔[۱۰]

قرآن حکیم نے گذشتہ قوموں کے حالات اس لیے بیان کیے ہیں کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے اور ان راہوں سے بچا جائے جن پر چل کر ان کی تباہی و بربادی ہوئی ہے۔ انھوں نے بے راہ روی اختیار کی، اپنے کو خداوندی سزا کا مستحق قرار دیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری اور کفر کی روش اختیار کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دم کے دم میں فنا کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی طاقت ضائع ہو گئی اور کوئی چیز کام نہ آئی۔

احوال و معارف کے کالم میں کسی بھی عنوان سے کوئی خاص خبر یا اہم بات دینی و اصلاحی، تاریخی یا سیاسی تحریر ہوتی تھی، جس کی وجہ سے انقلاب کے یہ تمام کالم نہایت اہم

ہوتے تھے۔ اس میں قاضی صاحب کے خود اپنے تجربات اور سیاسی مسائل وغیرہ بھی شامل ہوتے تھے۔

جیسے ۱۹۸۶ء کے احوال و معارف میں ''اپنا تعارف'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''بعض اوقات اپنا تعارف خود کرانا پڑتا ہے اور یہ صورت حال بہت دلچسپ ہوتی ہے اور ایک بار ہم کو بھی اپنا تعارف کرانا پڑا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں عرب و افریقہ کے سفر میں قاہرہ کے مختلف کتب خانوں میں آنا جانا رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہاں کے مشہور مکتبہ ''وہبہ'' میں گیا، ساتھ میں مولوی خالد کمال سلمہٗ بھی تھے۔ بہت بڑا تجارتی کتب خانہ تھا، ہم لوگ گھوم گھوم کر کتابیں دیکھ رہے تھے، مکتبہ کے مالک نے اس کی اجازت دے دی تھی، اوپر ایک گوشے میں چند نادر و نایاب کتابیں حفاظت سے رکھی ہوئی تھیں، ان ہی میں میری کتاب ''رجال السند والہند'' بھی رکھی ہوئی تھی۔ خالد کمال نے اسے ہاتھ لگایا تو مالک مکتبہ نے یہ کہہ کر اسے چھونے سے منع کر دیا کہ یہ کتاب تم لوگوں کے مطلب کی نہیں ہے اس کے قدردان دوسرے اہل علم ہیں۔ مگر باصرار کتاب نکالی گئی اور میں نے اپنا شناختی کارڈ دے کر مالک کو کتاب کے اوپر بحیثیت مصنف کے اپنا نام دکھایا۔ اب کیا تھا بے چارے نے معذرت کرنی شروع کر دی اور فوراً چائے منگوائی اور کہا کہ آپ لوگ سادہ لباس میں ہیں اس وجہ سے کوئی بڑے عالم نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے میں نے اس کتاب کو ہاتھ لگانے سے روکا۔ ہم نے کہا: ہندوستان کے علماء عام طور سے سادہ لباس میں رہتے ہیں اس لیے ان کو دیکھ کر ان کی علمیت نہیں معلوم ہوتی''۔

احوال و معارف

قاضی صاحب نے اخبار ''انقلاب'' میں جو دینی و اصلاحی مضامین ''احوال و معارف'' کے عنوان سے لکھے ہیں، ان میں سے بھی دو ایک مضامین یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔ جیسے ایک دینی مضمون ''شرّ الطعام'' کے نام سے ہے، جسے مولانا نے حضرت ابو ہریرہؓ

سے مروی حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کی تشریح کی ہے:

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بدترین کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس سے آنے والے کو تو روکا جائے اور انکار کرنے والے کو اس کی دعوت دی جائے اور جو شخص بلا شرعی وجہ کے دعوت قبول نہ کرے اس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی''۔ (مسلم)

قاضی صاحب نے اس حدیث کی تشریح کر کے عوام کو اس برائی سے باز رہنے کی تلقین کی ہے، جیسا کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے:

شادی بیاہ میں ولیمہ سنت ہے اس میں گھر، خاندان، محلّہ اور خویش و اقارب کے چھوٹے بڑے شریک ہو کر رشتہ ازدواج پر اظہار اطمینان و مسرت کرتے ہیں، ان سب کی خوشیاں اور دعائیں نکاح میں حسن و خوبی اور خیر و برکت کا باعث بنتی ہیں اور اس کی خوب خوب تشہیر ہو جاتی ہے۔ اس لیے ولیمہ کا کھانا کھلانا سنت پر عمل کرنا ہے۔ یہ دعوت ولیمہ عام لوگوں کے لیے ہے اس میں خاندان، محلّہ اور رشتہ دار، امیر و غریب باحیثیت و بے حیثیت اور عالم و جاہل کی تمیز نہیں ہے، بلکہ سب اس کے حق دار ہیں۔ اگر مختصر دعوت ولیمہ ہو تو اسی حساب سے امیروں کے ساتھ غریبوں کو بھی بلانا چاہیے اور بڑوں کے ساتھ چھوٹوں کو بھی۔ ورنہ یہ خیر و برکت کا کھانا بدترین کھانا ہو جائے گا اور اس سے شادی بیاہ میں نحوست و نابرکتی آجائے گی۔

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ غریبوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ صرف انھیں لوگوں کو شریک ولیمہ کیا جاتا ہے جو لوگ روز بہتر سے بہتر غذا کھاتے ہیں، ان کی خوشامد کی جاتی ہے۔ ان کے آنے پر لوگ فخر محسوس کرتے ہیں، تو ایسا کرنا سنتِ رسولؐ پر عمل کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنی ذہنی گراوٹ اور طبیعت کی دناءت کا مظاہرہ ہے۔ ایسی دعوت ولیمہ میں شرفاء اور ارباب علم و فضل کو خاص طور سے نہیں جانا چاہیے کیونکہ سراسر دنیاداری اور مکاری و ریاکاری ہے۔ ایسے ولیمہ کے کھانے کو لسان شریعت نے ''شرّ الطعام'' کہا ہے۔[۱۱]

''احوال و معارف'' کے کالم کا ایک عنوان ''دین سے بے زاری کا انجام'' بھی ہے۔ جسے قاضی صاحب نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔

لکھتے ہیں کہ:

''جبیر بن نضیر راوی ہیں کہ فتح قبرص کے موقع پر نصاریٰ قیدی ہاتھ

آئے اوران کوالگ الگ جماعتوں میں تقسیم کردیا گیا تو رونے لگے اور ایک دوسرے سے مل کر اپنی مصیبت بیان کرنے لگے۔ میں نے اس حال میں ابودرداءؓ کو دیکھا کہ ایک جگہ تنہا بیٹھے رو رہے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آج جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کو فتح ونصرت سے نوازا ہے تو آپ کیوں رو رہے ہیں، حضرت ابودرداءؓ نے جواب دیا کہ جبیر جب مخلوق اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پرواہ نہیں کرتی ہے تو اس کے نزدیک کتنی بے حیثیت ہو جاتی ہے۔ یہ رومی قوم قاہر و جابر تھی، اس کی حکومت تھی، مگر جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے رو گردانی کی تو ان کا جو حال ہوا وہ تم دیکھ رہے ہو"۔

قاضی صاحب اپنے مطالعے کو اپنے انداز میں اس طرح لکھتے ہیں کہ:
"قبرص کے رومی، عیسائی اپنے دور کے متمدن لوگ تھے، دنیاوی جاہ و حشم رکھتے تھے۔ ان کی حکومت تھی، ان کے پاس اس دور میں بہتر فوج تھی، جو سامانِ حرب وضرب سے لیس تھی، ان کے مقابلہ میں عرب بظاہر کچھ نہیں تھے، مگر جب مقابلہ ہوا تو رومیوں کو شکست اور عربوں کو فتح ہوئی، کیونکہ رومیوں نے عیش وعشرت میں پڑ کر احکامِ خداوندی سے روگردانی کی اور اللہ کی زمین پر فساد برپا کیا۔ اسی طرح جب کوئی جماعت یا قوم بے راہ ہو جاتی ہے تو اس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے خاص طور سے اس قسم کے واقعات میں عبرت و نصیحت ہے، ان کی شکست کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ان کی احکامِ خداوندی سے روگردانی ہے"۔[۲]

اسی طرح احوال ومعارف کے اور بھی عناوین ہیں جو اس طرح ہیں:

(۱) "سرسید مرحوم کی یاد میں" ۱۹۶۳ء
(۲) "تشکر وامتنان" ۱۹۸۴ء
(۳) "ثواب کے کام" ۱۹۸۷ء

یہ تمام مضامین بہت اہم ہوتے تھے۔ اس میں قاضی صاحب کے خود اپنے

تجربات اور سیاسی مسائل بھی پائے جاتے تھے۔

"البلاغ" (ممبئی)

۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ "البلاغ" کا اجراء ہوا، اس کا پہلا شمارہ جون میں منصۂ شہود پر آیا، اس وقت اس کے مدیر مسئول جناب محی الدین منیری صاحب تھے۔

اس رسالے میں شروع سے ہی بیش قیمت مضامین شائع ہوتے رہے جو علمی، دینی اور فکری ہوا کرتے تھے۔ ابتداء میں قاضی صاحب نے اس میں مجلسِ ادارت کے رکن کی حیثیت سے کام کیا، لیکن جلد نمبر۲ کے شمارہ نمبر ۹ سے مدیر تحریر کی حیثیت پر کام کرنے لگے۔ انھوں نے البلاغ میں نہایت معیاری اور اخلاقی مضامین لکھے۔ البلاغ کا ایک خاص کالم "افکار و مطالعات" کے عنوان سے ہوا کرتا تھا۔ اس عنوان کے تحت اصلاحی، سیاسی و سماجی اور معاشرتی مسائل زیرِ بحث رہا کرتے تھے۔ ان مضامین کے ذریعہ امت کی اصلاح اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ دینی وقومی بیداری لانے کی کوشش کی جاتی تھی اور کبھی اس کالم "افکار و مطالعات" کے علاوہ ایک تفصیلی مضمون بھی ہوتا تھا، جس سے اہل علم کے ساتھ درمیانی طبقہ بھی مستفید ہوتا تھا۔

جب قاضی صاحب مدیرِ تحریر ہوئے تو "البلاغ" کی ادارتی تحریر شذرات کے عنوان سے ہونے لگی، اس میں زیادہ تر مولانا کے مطالعے کا نچوڑ اور اہم خبریں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اشتراکی روس کے خداؤں نے اپنے اقتدار کے ابتدائی دور میں جس تنگ دلی اور تنگ ظرفی کا ثبوت دیا اس کا ظہور روس کی آہنی دیواروں سے پار ہوکر دنیا میں عام ہوا اور شخصیت پرستی وآمریت کے اس نئے ایڈیشن نے اذیت کے نشہ میں اخلاق وروحانیت، دین ودیانت اور مذہب وشرافت پر اور ان کے حاملین پر جو ظلم وستم کیے ہیں ان کی وجہ سے دنیا اب تک اپنے کانوں میں مظلوموں کی آہ کو محسوس کررہی ہے"۔ ۱۳

قاضی صاحب کا یہ کالم "افکار و مطالعات" ایک طرح کا اداریہ ہی ہوتا تھا، کیونکہ اس میں مختلف امور پر بحث وتمحیص ہوتی تھی۔

۱۹۵۸ء کے شمارہ سے ماہنامہ ''البلاغ'' میں ایک نئے سلسلے کا آغاز ''مطالعات و تعلیقات'' کے عنوان سے ہوا۔ اس کے مضامین بھی کافی دلچسپ اور پر اثر ہوتے تھے کیونکہ ہر مضمون علمی و تحقیقی اور تفصیلی ہوتا تھا اور ہر اہم بات بحوالہ پیش کی جاتی تھی، کچھ شماروں تک یہ دونوں کالم ساتھ ساتھ تھے، مگر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے صرف ''مطالعات و تعلیقات'' کا ہی سلسلہ باقی رہا اور ''افکار و مطالعات'' کے کالم کو ختم کر دیا گیا۔

''مطالعات و تعلیقات'' کے تحت ذیلی عناوین بھی ہوتے تھے، جن میں مفید سے مفید تر باتیں ہوتیں تھیں۔ ذیل میں چند ایک اقتباس شاہد ہیں۔

''امن و امان کو غنیمت سمجھو'' اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث بیان کر کے اس کی تشریح کی ہے۔

> ''تم لوگ اپنے اعمال کے ذریعہ ان فتنوں کے آگے بڑھ جاؤ گے جو ایک اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے۔ آدمی صبح کو مومن ہوگا اور شام کو کافر ہوگا پھر شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر ہوگا۔ اپنے دین کو دنیاوی سامان کے بدلے فروخت کرے گا''۔ (مسلم شریف)

اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد اندھیری رات کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس کی تشریح کی ہے اور نیک کام کی ترغیب دیتے ہوئے فتنہ و فساد سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کے ذیلی عناوین اس طرح ہیں:

(۱) عبادت اور تجارت

(۲) اپنی بدخواہی نہ کرو

(۳) مرض و صحت میں عقیدۂ توحید

(۴) دعا اور دوا

(۵) ذاتی ملکیت یعنی عوامی دولت

(۶) مال اور انفاق

(۷) حضرت ام زفر حبشیہؓ۔

حضرت ام زفر حبشیہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ یہ صحابیہ حضرت ام

المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے سر مبارک میں کنگھی کیا کرتی تھیں۔ اپنے مرض ''مرگی'' پر صبر کرنے کی وجہ سے جنتی قرار پائیں۔[۱۴]

اسی طرح کے مضامین ''مطالعات وتعلیقات'' میں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۶ء سے ایک نیا کالم ''شذرات'' کے عنوان سے بھی شائع ہونے لگا۔ اس میں ''البلاغ'' کی اداراتی تحریر ہوتی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل 'افکار و مطالعات'' بھی ایک منفرد قسم کا اداریہ ہی تھا، جس میں موصوف کی نظر بیک وقت متعدد مسائل پر مرکوز رہا کرتی تھی۔

شذرات میں بھی اسی طرح کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک زمانے میں بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا کہ ''اسلام چاند پر جانے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اور قرآن میں کیا لکھا ہے؟۔

اس سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ''اسلام کوئی برّی، بحری، فضائی اور آسمانی سفر کا چارٹ نہیں پیش کرتا، یہ کوئی سفرنامہ یا مسافروں کے لیے ہدایت نامہ نہیں ہے بلکہ اسلام ایک کامل و مکمل دین اور انسانیت سازی کے مکمل اصول وقوانین ہے اس کے عقائد میں توحید، رسالت، مجازات، قیامت، جنت، جہنم، تقدیر، فرشتے وغیرہ ہیں۔ اور اعمال میں کچھ عبادات ہیں، جن کا تعلق عبد و معبود کے درمیان عبدیت و بندگی سے ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حلال وحرام وغیرہ۔ اور کچھ معاملات ایسے ہیں جن کا تعلق بندوں سے ہے اور آپس میں ان کا برتاؤ ہوتا ہے جیسے حسن اخلاق، ہمدردی، تعاون خیر خواہی، باہمی ملاپ، رواداری وغیرہ۔

اسلام اور قرآن کا براہِ راست عقائد و اعمال کے ان دونوں شعبوں سے تعلق ہے، ان کا جغرافیہ، سائنس، فلسفہ، ریاضی اور اسی قسم کے دوسرے علوم وفنون سے جن کو انسان اپنی مادّی اور دنیاوی زندگی میں استعمال کرتے ہیں براہِ راست کوئی تعلق نہیں''۔[۱۵]

''مطالعات وتعلیقات'' کے تحت جو مضامین شائع ہوئے تھے وہ بھی نہایت اہم اور بیش قیمت و سبق آموز ہوتے تھے اس کی بھی چند ایک مثالیں پیش ہیں۔

(۱) مثالی سخاوت

(۲) اشعب بن جبیرؓ کا واقعہ

(۳) مالک مکان کی ذمہ داری

اس عنوان کے تحت قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت ابوحکم بجلیؒ کا بیان ہے کہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص کھیتی باڑی اور گلہ وریوڑ کی حفاظت کے سوا کتا رکھے گا تو اس کے نیک عمل میں ہر روز ایک قیراط کی کمی ہوگی۔ یہ سن کر میں نے عرض کیا اے ابن عمرا اگر کتا کسی مکان میں ہو اور میں اسے ناپسند کروں تو کیا ہوگا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا، اس کا گناہ گھر والے پر ہوگا جو مالک ہے اور اسی طرح اگر کسی گھر میں برائی ہوتی ہو اور اس کے کرایہ دار یا ٹھہرے ہوئے لوگ اسے سخت ناپسند کرنے کے باوجود اسے مٹانے کی طاقت نہیں رکھتے تو ایسی حالت میں سارا گناہ مالک مکان پر ہوگا۔ اس کے رہنے والے گنہ گار نہیں ہوں گے۔ بشرطیکہ یہ لوگ اس برائی کو ناپسند کرتے ہوں۔ اور کسی درجہ میں اسے بہتر نہ سمجھتے ہوں"۔[۱۶]

ماہنامہ ''البلاغ'' میں بے شمار اعلیٰ اور عمدہ مضامین ہیں۔ جو اپنے پڑھنے والوں کو لطف و سرور بخشتے ہیں۔ ذیل میں چند مضامین کے عناوین درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) فقہ اہل سنت کی ابتدائی تاریخ، جولائی ۱۹۵۴ء

(۲) سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ، اگست ۱۹۵۴ء

(۳) علماءِ اسلام کے القاب وخطابات، ۱۹۵۵ء

(۴) اسلام اور عیسائیت، نومبر ۱۹۶۶ء

(۵) عہد رسالت میں مدینہ منورہ کی عید، ۱۹۶۵ء

(۶) حکومتِ مصر کا قرآنی تحفہ، ۱۹۶۷ء

(۷) خانقاہیں اور مدرسے، ۱۹۵۹ء

(۸) یہودیت اور صہیونیت، ۱۹۶۷ء

(۹) مجاہدین ہند بنو ابی العاصی ثقفیؓ، ۱۹۶۷ء

(۱۰) مسلمانوں کا نظام تبلیغ وتذکیر، ۱۹۵۶ء

(۱۱) قصبہ مبارک پور تاریخ کی روشنی میں

(۱۲) فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد، ۱۹۶۳ء

اس مجلّہ میں بہت سے مضامین قسط وار بھی شائع ہوتے تھے۔ چند مضامین کے عنوان درج ذیل ہیں:

(۱) دینی تعلیم کے عمومی مراکز جوامع ومساجد،۱۹۶۵ء
(۲) مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاع مشرقی سے،۱۹۶۶ء
(۳) نارجیل سے نخیل تک،۱۹۶۲ء

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں قاضی صاحب کی یہ تحریر ملاحظہ ہو جس میں ان کے فضل وکمال کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''حضرت جنید بغدادیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور عظیم محدّث وفقیہ تھے، ان کا اصل نام ''جنید'' والد کا نام ''محمد'' کنیت ''ابوالقاسم'' اور لقب ''سید الطائفۃ'' تھا۔ ان کے والد شیشے کی بنی چیزوں کی تجارت کرتے تھے، جس کی وجہ سے انھیں ''زجاج'' اور ''قواریری'' بھی کہتے ہیں''۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پیدل چل کر تنِ تنہا تیس حج کیے اور موت کے وقت پورا قرآن زبانی ختم کیا، لیکن جب دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو سورہ بقرہ کی ستر آیتیں ہی پڑھنے پائے تھے کہ اپنے رب حقیقی سے جاملے''۔[۱۷]

ماہنامہ البلاغ میں اسی طرح کے اہم واقعات اور دینی باتیں شائع ہوتی تھیں جس کی وجہ سے اسے ایک منفرد وممتاز مقام حاصل رہا، جب تک یہ رسالہ نکلتا رہا، اہلِ علم و ارباب فکر وبصیرت حضرات سے داد تحسین وصول کرتا رہا۔

حوالے

۱۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۱۱۳

۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات، ص ۱۲۴، ۲۰۰۳ء

۳۔ زبانی معلومات، قاضی احمد (قاضی صاحب کے چچازاد بھائی، ۲۹ر دسمبر ۲۰۰۷ء

۴۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات، ص ۹۶، ۲۰۰۳ء

۵۔ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، ماہنامہ ضیاءالاسلام، قاضی اطہر نمبر ص ۱۸، ۲۰۰۳ء

۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۷۔ اخبار انصار

۸۔ قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات، ص ۱۰۶، ۲۰۰۳ء

۹۔ سوہ نساء، پ-۴، رکوع نمبر ا، آیت نمبر ۱۰، روزنامہ انقلاب، جواہر القرآن، ص ۳، ۱۹۷۶ء

۱۰۔ سورہ المؤمن، پ ۲۴، رکوع نمبر ۸، آیت نمبر ۲۱، روزنامہ انقلاب، جواہر القرآن، ص ۳، ۱۹۷۷ء

۱۱۔ روزنامہ انقلاب، ص ۲، اپریل، ۱۹۷۶ء

۱۲۔ روزنامہ انقلاب، ص ۲، ۱۹۷۶ء

۱۳۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ البلاغ، افکار و مطالعات، جلد ۳، شمارہ ۱، جون ۱۹۵۶ء

۱۴۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ البلاغ، مطالعات وتعلیقات، ج ۸، شمارہ ۱۵، جون ۱۹۶۲ء

۱۵۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ البلاغ، شذرات، ج ۱۵، شمارہ ۱۵، ص ۲، فروری ۱۹۶۶ء

۱۶۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ البلاغ، مطالعات وتعلیقات، ج ۱۵، شمارہ ۱۰، ص ۹ تا ۱۰، فروری ۱۹۶۶ء

۱۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ البلاغ، ص ۲۸-۳۳، اگست ۱۹۵۵ء

☆☆☆
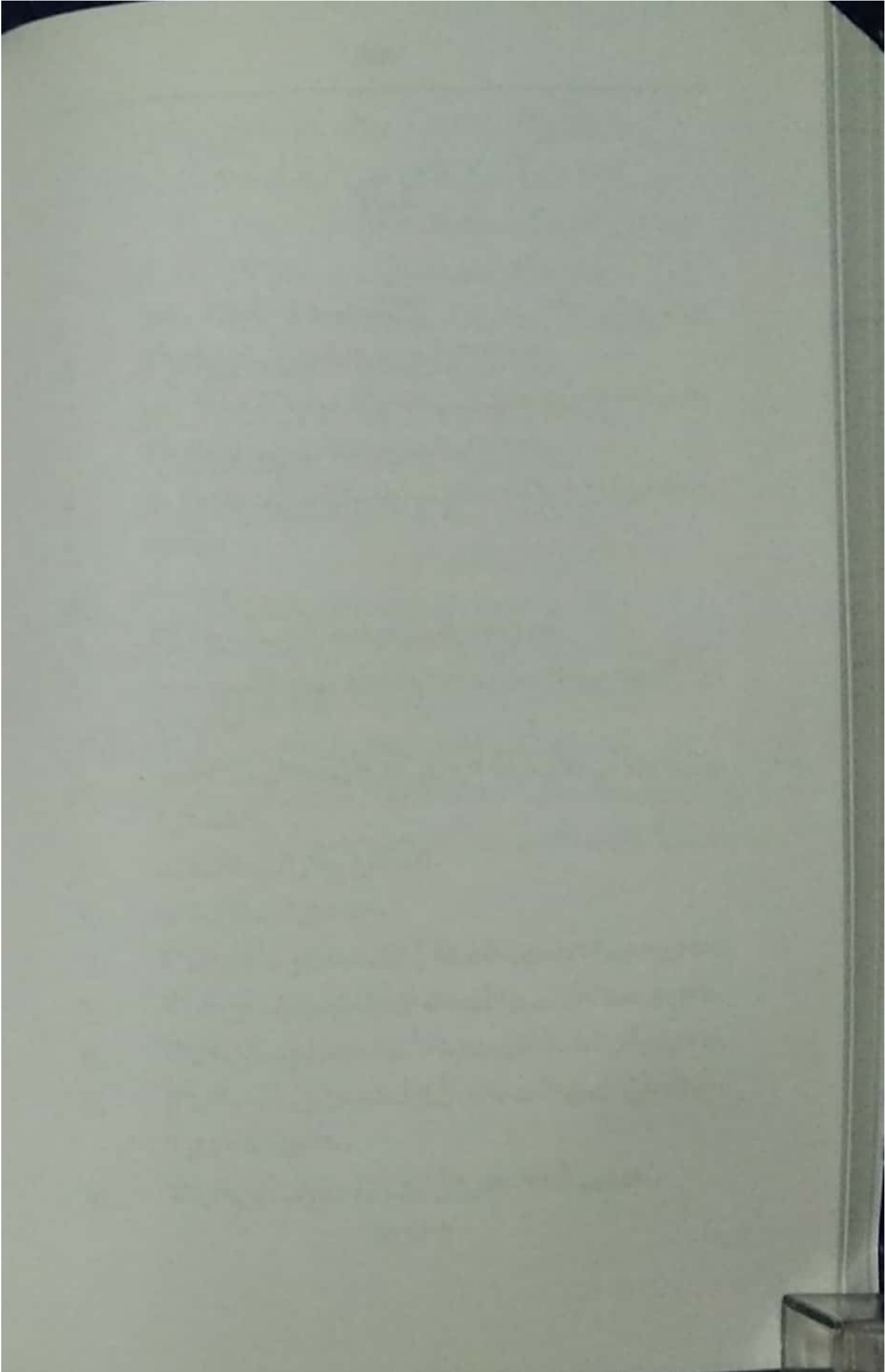
باب پنجم

شاعری

قاضی اطہر مبارک پوری کی طبیعت میں فطری ملکۂ شاعری اوائلِ عمر سے ہی موجود تھا، جس نے انھیں ایک قادر الکلام شاعر بنادیا تھا۔ وہ سہ لسانی شاعر تھے۔ یعنی اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ وہ ایک باشعور، بیدار مغز، روشن خیال اور انقلابی شاعر تھے۔ ''ان کی شاعری کسبی نہیں وہبی تھی''۔ [۱] مگر ان کے عظیم الشان علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں کی موجودگی میں ان کی شاعری کا کماحقہ تعارف نہیں ہوسکا۔

یوں تو قاضی صاحب کے اساتذہ میں کوئی شاعر نہیں تھا، جس سے وہ نکاتِ سخن کی آگہی حاصل کرتے، مگر ان کی شخصیت پر ان کے عہد اور ماحول کا زبردست اثر پڑا۔ [۲] جس ماحول اور جس عہد میں انھوں نے آنکھ کھولی، اس میں شعر و ادب، زبان و بیان، قواعد و عروض کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کے ماموں مولانا محمد یحییٰ (۱۳۲۸ھ-۱۳۷۸ھ) اور نانا احمد حسینؒ (۱۲۸۸ھ-۱۳۵۹ھ) عربی و فارسی کے بہترین اور قابل شاعر تھے۔ [۳] احمد حسینؒ کا عربی کلام ۱۹۵۸ء میں ''دیوان احمد'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے شعری مزاج کی تشکیل بھی ننھیال سے ہی ہوئی اور انشاء پردازی، ادب، عربی و فارسی کے وسیع مطالعے نے مزید رنگ بخشا۔ مولانا اپنی کم عمری میں ہی بہترین اشعار کہنے لگے تھے۔ اس بات کی تصدیق خود ان کی تحریر سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اردو تعلیم ہی کے زمانہ سے شعر و شاعری کا ذوق ابھرنے لگا تھا اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی''۔ [۴]

شاعری کے اسی جذبے نے انھیں دوستوں اور عزیزوں میں مقبولیت بخشی۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز اصلاحی و مذہبی نظموں سے کیا۔ اپنی پہلی نظم میں ماضی کی یادوں اور اسلاف کے کارناموں کو اس طرح منظوم کیا ہے۔

الٰہی پھر وہی ساقی وہی میخانہ ہوجائے
حجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہوجائے
شبستانِ جہاں توحید کا کاشانہ ہوجائے
ہر اک فردِ بشر اسلام کا دیوانہ ہوجائے
الٰہی پھر پتنگوں میں امنگ و سوز پیدا کر
الٰہی پھر رخِ اسلام پر دنیا کو شیدا کر [۵]

سب سے پہلے یہ نظم "مسلم کی دعا" کے عنوان سے رسالہ "الفرقان" بریلی میں ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوئی، پھر عنوان کی تبدیلی اور الفاظ کی معمولی ترمیم کے ساتھ "نالہ اطہر" کے عنوان سے ماہنامہ "قائد" مراد آباد میں ۱۹۳۹ء میں چھپی۔

اچھی شاعری کے لیے وسعت علم نہایت ضروری ہے جسے قاضی صاحب نے پہلی ہی جدّ وجہد کر کے حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے فرصت کے لمحات کو بھی مثبت جہتیں دے کر اسے مفید سے مفید تر بنایا اس لیے ان کی شاعری نے ان کی جہات علمی کو روشنی دے کر اسے رنگ بصیرت سے نوازا۔ اور ان کے علمی سفر کی راہوں میں مرحلۂ شوق ثابت ہوئی اور زندگی کا سبق حاصل کرنے کا وسیلہ بھی۔ مگر ان کی منزل نہیں بن سکی۔ مولانا کی منزل تحقیق وتصنیف تھی اس لیے وہ زیادہ دیر تک شاعری کی تصوراتی کائنات اور تخیلی فضا میں نہیں رہ سکے۔ انھوں نے شعروشاعری سے قطع تعلق کر کے اپنے قیمتی اوقات کو اہم کاموں میں صرف کیا۔

لیکن فراغتِ علمی کے بعد جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو شاعری ہی ان کا زاد سفر بنی۔ لاہور میں ان کے حلقۂ احباب میں زیادہ تر شاعر ہی تھے۔ مثلاً علامہ انور صابری، مولانا محمد عثمان فارقلیط، احسان دانش، علامہ تاجور نجیب آبادی، ظفر ملتانی، عشرت کرتپوری، اظہار اثر کرتپوری، سردار ہربنس سنگھ باغی، شیو پرساد بہاری وغیرہ۔[۵] ان حضرات سے قاضی صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ اور اکثر و بیشتر شعری محفلیں منعقد ہوتیں۔ جن سے مولانا کی شاعری کو کافی تقویت ملی۔

انسان، سماج، تہذیب یہ تین دائرے تھے جن کے ذریعے وہ اپنی شاعری کا نمونہ فراہم کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ مراقبہ کی کیفیت اور اعتکافی ذہنیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی زود گوئی بہترین اشعار کا ذریعہ تھی۔ ان کے اشعار، سادہ اور عام فہم ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری کو عوام میں بڑی مقبولیت تھی۔

قاضی صاحب کی شاعری نے ہر دور میں حالات و زمانہ کا ساتھ دیا ہے اور ان کے فکر وفن میں روح عصر کی بڑی کارفرمائی ہے۔ ان کے یہاں نعت، نظم، غزل، قطعہ، شخصی نوحے، مرثیے کے علاوہ ساقی نامہ، شاہنامہ اور مثنوی کے رنگ میں بھی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر کلام جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل تھا، حالاتِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ قمر الزماں مبارک پوری کی یہ تحریر اس بات کی غماز ہے:

''مولانا کی وہ شاعری جو اپنے آثار کھو چکی ہے اپنے دور کی سچی ترجمان اور گرد و پیش کی بہترین عکاس تھی، ان کا کلام زندگی کی تنقید بھی تھا اور اس کی تفسیر بھی۔ وہ جذباتِ انسانی کی تصویر بھی تھا اور خوش آئند زندگی کی تعبیر بھی''۔ ٦

سطور ذیل میں مختلف اصناف سخن میں ان کے کلام کا تعارف کرایا جا رہا ہے:

نعتیں

اصناف سخن میں نعت ایک مشکل صنف ہے، کیوں کہ اس میں غلو و کتمان سے بچنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ شاعر اگر اس میں حد سے تجاوز کرتا ہے تو غلو ہونا لازمی ہے۔ اس لیے نعت میں مبالغہ آمیزی سے بچنے کے لیے اعتدال ضروری ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی شاعری میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے اور بہت معتدل انداز میں نعتیں کہی ہیں۔ ان کی نعتیں اردو اور فارسی زبان میں ہیں۔ وہ خصوصیات و امتیازات ، خیالات و جذبات، ارتعاشات، فکر و خیال، عقیدہ و عقیدت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ کیونکہ ان میں دینی شعور اور شرعی احتیاط کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان میں کہیں کہیں منظر کشی اور وقت و حالات کی عکاسی کا احساس بھی ملتا ہے۔ ان کی نعتوں میں نبی اکرمؐ سے والہانہ محبت و عقیدت کے ساتھ آپؐ کے پیغام محبت کو پھیلانے کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ ان کے افکار اسلامی اقدار و روایات کے امین ہیں، وہ کائنات میں کامیابی کا منبع نبی محترمؐ کی ذات کو قرار دیتے ہیں ان کی نعتیہ شاعری سادہ، پر اثر، اور دلکش پیرایۂ بیان کا نادر نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ انھوں نے نعت گوئی میں احساس کو خیال اور یقین میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ عشق رسولؐ کے تقاضے پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں چھ نعتیں شامل ہیں۔ پہلی نعت میں نبی اکرمؐ پر درود و سلام بھیجا گیا ہے اور دوسری نعت میں عرب کے حالات، وہاں کی جہالت و تاریکی کا بیان اور رسم و رواج کو منظوم کرتے ہوئے آخر میں نبیؐ کی تشریف آوری کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

عرب ہی کیا! غرض دنیا کا ہر گوشہ اندھیرا تھا
تباہی نے بنی آدم کے ہر بستی کو گھیرا تھا
ہلاکت خیز طوفاں بحرِ شیطانی سے اٹھے تھے
تمام اہل جہاں اک آگ کے دریا میں ڈوبے تھے

وہ اپنے باپ، دادا، قوم کی رسموں کو پکڑے تھے
خیال وہم کی مضبوط زنجیروں کو جکڑے تھے
غرض سارے جہاں پر اک گھٹا ظلمت کی چھائی تھی
جہالت نے تمام عالم میں اک آفت مچائی تھی
یہ حالت دیکھ کر دریائے رحمت جوش میں آیا
خدا نے اپنی سنت کے موافق رحم فرمایا
محمد مصطفیٰ صل علی تشریف لے آئے
عرب کے ملک مکہ میں حرا کی راہ سے آئے ۷

قاضی صاحب نے نعتیہ قصیدہ بھی کہا ہے۔ اس کے اشعار اس طرح ہیں:

اندھیری رات بادل کی گرج، بجلی، ہوا، پانی
زمیں بھیگی، فضا پر ہول، ہر سو زور طوفانی
پپیہے کی صدائے درد آ گیں شاخساروں میں
گھنیرے جنگلوں میں جا بجا جگنوں کی تابانی
جھڑی برسات کی، جل تھل زمیں ہے، ابر گردوں پر
یہ کس کی یاد میں کی آسماں نے اشک افشانی ۸

درج بالا نعتیہ قصیدہ چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ قاضی صاحب کے مجموعہ کلام مئے ظہور میں کل تین نعتیہ قصیدے شامل ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نعتیں کم کہتے تھے اور اصلاحی نظمیں زیادہ کیونکہ ان کے مجموعۂ کلام میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ مولانا کے دوست اسیر ادروی کے بیان سے خود اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ:

''ان کی شاعری اصلاحی نظموں تک محدود تھی، کبھی کبھار کوئی نعت لکھ دیتے تھے''۔ ۹

انھوں نے ''بہار مدینہ'' کے عنوان سے بھی نعت کہی ہے، اسی طرح فارسی زبان میں جو لغت کہی ہے وہ ''بسوئے رحمت اللعالمین'' کے عنوان سے ہے، جو اکیس اشعار پر مبنی ہے۔ اس کے اشعار اس طرح ہیں:

بہنم بہ ہجرش برہم نظامے
در شام صبحے، در صبح شامے

در صبح رویش شمسے درخشاں
شمسے چہ شمسے ، شمسے مدامے
صدیقؓ و فاروقؓ ، عثمانؓ و حیدرؓ
در بند زلفش اصید بدامے
اے شاہِ عالم ! باسوز فرقت
گوید سلامے ، ادنیٰ غلامے ۱۰

نظمیں

مولانا کی شاعری ایک آئینہ تھی جس میں ہر چیز کی پرچھائی منعکس ہو جاتی تھی، چنانچہ مولانا نے جب شاعری کی ابتداء کی تو اس وقت قومی تحریکوں کی ہنگامہ آرائیاں عروج پر تھیں۔ ان تحریکوں میں مسلم لیگ، کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں، آریہ سماجیوں کی مذہبی تحریکیں، شدھی کرن کی مہم، مدح صحابہ اور قدح صحابہ کی آویزش، جلسے، جلوس، مسجد و مدرسہ کے چندہ کی ٹولیاں، ستیہ گرہ، مطالبۂ آزادی، بدیسی مال (عدم تعاون) کے بائیکاٹ کی تحریکیں شامل تھیں۔ ۱۱ جس سے انسانی زندگی متاثر ہونے لگی۔ اس وقت مولانا کی شاعری کو سازگار ماحول ملا اور انھوں نے اپنی فکری وفنی بیداری کو شعری سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ اور قوم کے نوجوانوں کو للکارتے ہوئے کہا:

اے حجازی شمع کے خوددار پروانو اٹھو
اے مکینِ محملِ یثرب کے دیوانو ! اٹھو
اے مئے اسلام کے مخمور مستانو ! اٹھو
کاروانِ دینِ احمد کے حدی خوانو ! اٹھو
پھونک دو تم ظلم کے خرمن کو اٹھ کر پھونک دو
کفر و باطل کو جہنم میں اٹھا کر جھونک دو ۱۲

یہ پوری نظم پندرہ اشعار پر مشتمل ہے اور اسی طرح جذبات کو بیدار کرنے والی ہے۔ اس کا عنوان بھی بہت سوچ سمجھ کر ''بانگ جرس'' رکھا ہے۔

ان کی سیاسی نظموں میں ایک نظم ''جمعیۃ العلماء ہند'' بھی ہے، جس میں غزل کی شباہت پائی جاتی ہے۔ اس میں مولانا حسین احمد مدنی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے اشعار پرجوش ہی نہیں پرذوق بھی ہیں۔

نکل آئیں نیاموں سے تڑپ کر گرم تلواریں
رگِ باطل سے پھوٹیں بے محابا خون کی دھاریں
چلو اٹھو بڑھو حملہ کرو باطل سے ٹکراؤ
اگیں کشت وفا میں غازیانِ دیں کی للکاریں
جب آجاتی ہے دستِ حق پرئی میں ید اللّٰہی
لرز جاتی ہیں قصرِ کفر کی مضبوط دیواریں ۱۳

قاضی صاحب اپنی طالبِ علمی کے زمانہ میں ہی ''جمعیۃ العلماء ہند'' سے متاثر ہو چکے تھے اور اس وقت مبارک پور کا مدرسہ احیاء العلوم تحریک آزادی کی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، لیکن پورے ضلع کا مرکز ''دارالمصنفین اعظم گڑھ'' تھا۔۱۴

قومی وسیاسی مسائل کے ساتھ موصوف کی زیادہ تر نظمیں غزلیہ انداز میں ہیں۔ جس میں علم دین سے واقفیت اور عالمانہ شان پائی جاتی ہے اور مذہب وملت کی تربیت کا مقصد بھی مضمر ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کا مقصد شخصیت سازی ہے۔ انھوں نے نظموں میں تاریخ اسلام سے افادہ کیا، اس لیے زیادہ تر نظمیں قدرتِ کلام پر شاہد ہیں۔ ان کا کلام سادہ، سہل اور عام فہم ہے۔ مولانا اپنی نظموں میں قصہَ پارینہ نہیں داستان حیات سناتے ہیں۔ ان کی نظم صبحِ آزادی میں اسی طرح کے اشعار ملتے ہیں جس میں وطن کے لیے قربانیاں پیش کرنے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

لیے عزمِ جواں مردی لٹا کے اپنا تن من دھن
ہمارے جاں نثاروں نے سجائی صبح آزادی
کیا آباد زنداں کو کبھی دار و رسن چوما
لگائی جان کی بازی تو آئی صبح آزادی

اسی طرح نظم ''غازی'' میں بھی مسلمانوں کو راہِ عمل پر گامزن رہنے، ہمت ومحنت سے کام لینے اور حوصلوں کو بلند رکھنے کا درس دیا گیا ہے۔

چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں:

چھا جاتا ہے ماحول پہ جب رنگِ تباہی
آنکھوں میں جب آجاتی ہے افسردہ نگاہی

جب عقل بھٹک جائے سیہ خانہ سر میں
پلکوں کے شکنجوں میں کسے دور نگاہی
اس وقت بھرتا ہے کوئی غازئ میداں
باہمت و باہیبت و باژرف نگاہی
اس طرح پلٹ دیتا ہے تقدیر کا پانسہ
مٹ جاتی ہے تدبیر کے چہرے سے سیاہی

یہ نظم ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو کہی گئی تھی اس نظم میں وحدت فکری نمایاں ہے۔ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر غفلت سے بیدار کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے ایک نظم ''امیری اور مفلسی'' ہے جس میں انھوں نے اپنی قوتِ مشاہدہ کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اک طرف لیتے ہیں سیم وزر خزانوں میں ڈکار
اک طرف پھرتی ہے آوارہ غریبی کی پکار
اک طرف عشرت کے نغمے تمکنت کے ساز سے
اک طرف ہے شورِ ماتم دکھ بھری آواز سے
اک طرف آسودگی ہے، اک طرف فاقات ہیں
اک طرف ہے چاندنی اور اک طرف ظلمات ہیں

یہ نظم سات مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں حالات حاضرہ کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

ایک نظم ''آوازِ خلیل'' کے عنوان سے بھی لکھی ہے، جس میں آنے والے اچھے وقت کا انتظار جھلکتا ہے۔ یہ نظم پچیس اشعار پر مبنی ہے، جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

فتح کا مژدہ سنادو مشرقی اقوام کو
زندگی ملنے لگی ہے عالم اسلام کو
کردے جو سیراب اس دنیائے تشنہ جام کو
آج بھی جاری ہے زمزم کی وہ نہر سلسبیل
الرحیل اے رہروانِ راہ کعبہ الرّحیل
ایک ملت، ایک امت، ایک ہی فکر و نظر

سرزمینِ اندلس سے تابخاکِ کاشغر
ہوں گے انساں بھائی بھائی، ہوگی دنیا ایک گھر
آج پھر ہوگی یہ امت بے مثال و بے عدیل
الرحیل اے رہروانِ راہ کعبہ الرحیل ؏

اس مجموعہ کلام میں کل تیس نظمیں شامل ہیں۔ ان کے عناوین یہ ہیں۔ نالۂ اطہر، صبح آزادی، اعلانِ آزادی، جمعیۃ علماء ہند، ترانۂ مجاہد، غازی، اشارات، رموزِ امروز، آوازِ خلیل، ساقی نامہ، وقت کی پکار، صدائے بیداری، کوکن کی ایک چاندی رات، ہمارا ماضی، نوجوان مسلمان، انقلاب عہدِ حاضر کیا جانے، جنگی ساز، فراموشی، گراں خوابی، حیاتِ ابدی، بانگِ جرس، جوش و خروش، تقاضا، تم اور ہم، امیری اور مفلسی، بہار، عزم تعمیر، ترانۂ جہاد، عزم مومن وغیرہ۔

غزلیں

غزل میں کوئی بات براہِ راست اور سیدھے طریقے سے نہیں کی جاتی اشارات و تمثیلات ہی غزل کی جان ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کی شاعری میں بھی یہ خوبی موجود ہے، اکثر شاعر غزلوں کو عشق و عاشقی اور حسن و شباب سے ہی مزیّن کرتے ہیں۔ مگر قاضی صاحب کی غزلوں میں شباب اور جذبات کے بجائے بزرگانہ نصیحت اور سبق آموزی کا رجحان نظر آتا ہے اور البتہ کہیں کہیں حسن و عشق کی داستانوں کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ یہ ہیں:

تمہاری یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں
ہم اپنے آپ کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں
خدا نے لذّتِ الفت ہمیں کو کیوں بخشی
یہ راز درد سے ہم خود چھپائے بیٹھے ہیں

اور کچھ غزلوں میں اس طرح ہے:

ایک نشانی کوئی چھوڑ جاؤ
شمع ہو روشنی چھوڑ جاؤ
میری قسمت نہ ہو بے سہارا
زلف کی تیرگی چھوڑ جاؤ

قاضی صاحب کی غزلوں میں عشقیہ کلام تو ضرور ہے، لیکن ان سے ظاہری مفہوم

مراد نہ لے کر باطنی افہام وتفہیم کو مدِ نظر رکھا جائے تو دینی واصلاحی پہلو صاف نظر آئے گا۔ اور ویسے بھی ان کے علامتی لفظوں میں غور وفکر کی دنیا آباد ہے۔ ان کی غزلوں کا لہجہ ان کے احساسات وپیغامات کی تفہیم وتعبیر کرتا ہے۔ ان کی غزلیں سوقیت اور عام طرزِ گفتار سے خالی ہیں۔ ان کے خیالات میں طہارت، تاثرات میں پاکیزگی اور مزاج میں میانہ روی واعتدال پسندی موجود ہے۔ اس کے علاوہ مقصدِ زندگی سے عشق، کام کرنے کی تڑپ اور اپنے وجود کی معنویت کو پانے کی لگن ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ خالص غزلیہ روح میں بھی اسلامی فکر، مذہبی حسیت اور دینی شعور کی روشامل ہے۔ چند غزلوں کے شعر درج ذیل ہیں:

اسلام کی جنسِ الفت کو آپس کی تعصب نے لوٹا
مسلم نے نگاہِ رحمت کو، شمشیر کفِ جلاد کیا

عیش ونشاط دہر کیا، دونوں جہاں بھی اے خدا
میری نظر میں ہیچ ہیں تو ہی اگر میرا نہیں

اسیر حلقۂ قوم و وطن ہے دیدۂ مومن
بپا ہے میکدہ میں امتیاز این و آں ساقی

قاضی صاحب کی سب سے پہلی غزل جو ''اسرار'' کے عنوان سے سہ روزہ ''زمزم'' لاہور کے شمارہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو شائع ہوئی تھی وہ یہ ہے:

خلوتِ بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ
بے خودی خودی میں ڈوب سرِ قلندری سمجھ

آہ سحر کی قیمتیں دے نہ سکیں گے دو جہاں
ساز شکستہ پر نہ جا، راز شکستگی سمجھ

ساحل اضطراب کیا، موج سکوں میں ڈوب جا
عشق کو برملا نہ کر، عظمتِ عاشقی سمجھ

عشق ہے بے خبر نہ سو، نخلِ سکوں کی چھاؤں میں
بے خودیِ حواس کو، فرصتِ آگہی سمجھ

سود و زیاں کی کاوشیں، موت ہیں اہل عشق کی
کوششِ نامراد کو، حاصل زندگی سمجھ

عشق کا سانس سانس ہے، شرح ادائے بندگی
اپنی ہر اک شکست کو، حسن کی برتری سمجھ

قلب و جگر کو چاک کر، خواہشِ التفات میں
پھر بھی اگر اثر نہ ہو، اپنے ہی میں کمی سمجھ

حسنِ نظر سے کام لے، غیر کا اعتبار کیا
حسنِ ایاز پر نہ جا، دیدۂ غزنوی سمجھ

یوں تو حیات نام ہے، سلسلۂ دراز کا
عشق میں لٹ گئی ہے جو، اسی کو زندگی سمجھ

قاضی صاحب کی یہ پوری غزل ایک فلسفہ نظر آتی ہے جس میں انھوں نے بہت سی ذہنی تحریک کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اور یہ وضاحت کی ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر نشیب و فراز ہوتے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں واقعات بھی، مگر انسان کو ہمیشہ اپنے حسن نظر اور عقل و خرد سے کام لینا چاہیے۔ قاضی صاحب کی پہلی غزل بھی وعظ و نصیحت سے پر ہے جو ان کی ذہنی ساخت کا غماز ہے۔

غزل میں انھوں نے اصغر گونڈوی کا طرز و انداز اختیار کیا ہے۔[۱۶] یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جو جذبہ و تاثر کی زیریں لہریں ہیں یا ان کے تغزل میں غزلیہ اسلوب و الفاظ کی جو رعنائیاں اور رنگینیاں شامل ہیں وہ اصغر کے اسلوب سے بہت قریب ہیں۔ انھوں نے اصغر گونڈوی کے دونوں مجموعوں ''نشاط روح'' اور ''سرود زندگی'' کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ بھی کیا۔[۱۷]

چنانچہ قاضی صاحب کے کلام میں ماضی کی طرف مراجعت کا رجحان موجود ہے۔ ان میں جو تڑپ اور لگن ہے وہ ماضی اور حال دونوں زمانوں سے تعلق رکھتی ہے اور جس طرح انھوں نے اپنے تاثرات اور خیالات کو بلا کم و کاست شعری انداز میں ڈھالا ہے اور بعینہ اسی طرح اپنے احساسات کو بھی اسی انداز میں مدغم کر دیا ہے۔ اس شعر میں ان کے احساسات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جو لطفِ زندگی پایا ہے میں نے فقر و فاقہ میں
تصور اس کا ہو سکتا نہیں ہے کج کلاہوں میں
جہاں والے اماں دیتے نہیں جب اہل غیرت کو
پناہیں ڈھونڈ لیتے ہیں وہ جا کر بے پناہوں میں [١٨]

زندگی کے ابتدائی ایام کی پریشانیوں اور وطن سے دور جانے کا صدمہ درج بالا اشعار میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کے جذبات کا اظہار دوسری غزل میں بھی موجود ہے:

مکمل کوچ سے پہلے ہی سامانِ سفر کر لیں
مناسب ہے ابھی روشن چراغِ رہ گذر کر لیں
ترستا ہے قفس میں عمر بھر صیاد گلشن کو
چمن پر آخری چلتے چلاتے اک نظر کر لیں

قاضی صاحب کی شاعری میں غزلوں کی بہتات ہے، اس کی تعداد تقریباً چھیاسٹھ (٦٦) ہے۔ انھوں نے غزلوں پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ ذرا سی فکر سخن میں کلام مکمل کر لیا کرتے تھے۔ ان کی غزلیں اخبار و رسائل میں مئے طہور کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں۔ مولانا نے اتنی کثرت سے غزلیں کہیں تھی کہ دو ضخیم دیوان تیار ہو چکے تھے، جو ممبئی سے وطن آنے میں ٹرین میں ہی چھوٹ گئے اور پھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا، اس طرح غزلوں اور شاعری کا بیش تر حصہ ضائع ہو گیا۔ [١٩]

مرثیے

مرثیہ عموماً واقعاتِ کربلا یا اولیاء دین کی وفات و شہادت پر کہا جاتا ہے مگر مولانا نے اپنے عزیز و اقارب کی وفات سے متائثر ہو کر مرثیے کہے۔ قاضی صاحب سے پہلے بھی شاعروں نے اپنے اعزاء کی وفات پر مرثیے کہے ہیں۔ جیسے مرزا غالب نے اپنے بھتیجے زین العابدین خان عارف کی وفات پر اور اپنی محبوبہ کی وفات پر کہا ہے۔ حالی نے غالب کی وفات پر اپنے دردِ قلب کا اظہار کیا ہے، علامہ شبلی نے اپنے بھائی اسحاق کا نوحۂ غم لکھا تھا۔ چکبست نے گوکھلے کا مرثیہ لکھا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنی ''والدہ کی یاد میں'' اور ''داغ دہلوی'' پر بھی مرثیہ لکھا۔

مرثیہ گو کی فہرست میں صفی لکھنوی، تلوک چند محروم، احسانؔ دانش، اقبالؔ سہیلؒ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے بھی چند محترم شخصیتوں کی دائمی جدائی پر مرثیہ لکھ کر

اپنی زبان دانی وقادرالکلامی کا نمونہ فراہم کیا ہے۔ان کے مرثیہ کی تعداد صرف چار ہے جس میں سے تین مرثیے اردو میں اور ایک عربی میں ہے۔یہ مرثیے ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔

پہلا مرثیہ انھوں نے اپنے استاذ محترم مولانا شکر اللہ مبارک پوریؒ کے انتقال پر لکھا تھا۔اس میں ان کے قومی و مذہبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی اہلیت واہمیت اور انفرادی خصوصیت کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی صحبت میں رہ کر جو بھی افادہ کیا اس کا بیان بھی شامل ہے۔اس میں کل بارہ اشعار ہیں چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

فدائے قوم و مذہب ملّتِ بیضاء کا دیوانہ
مہِ چرخ ہدایت یعنی شکر اللہ مولانا
بنا کے مدرسہ کو جس نے پہنچایا ثریا تک
اسی ساقی نے بخشا ہم کو علمِ دیں کا پیانہ
نظر خوں بار ہے مرحوم کی پھر یاد آتی ہے
کہے جاتی ہیں آنکھیں اپنی ناکامی کا افسانہ
خیالِ حضرت استاذ دل سے جا نہیں سکتا
مجھے اطہر بہت کچھ دے گئے ہیں مرے مولانا

دوسرا مرثیہ مولانا نے اپنی والدہ محترمہ کی یاد میں لکھا، جس میں اپنی زندگی کے آفات و آلام کو شعری زبان میں پرویا ہے۔اس مرثیہ میں ان کے جذبات کی شدّت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہ مرثیہ ''تصویرِ درد'' کے عنوان سے ہے:

درد تھا، رنج والم تھا، غم تھا، اور اک رات تھی
رات کیا تھی ، بہر دل افسانۂ آفات تھی
پڑ رہا تھا ہر طرف پہرہ اندھیری رات کا
وادیٔ ظلمات میں تھا کارواں ظلمات کا
روح میری یک بہ یک دنیا سے گھبرانے لگی
جانے کیوں ایسے میں یادِ والدہ آنے لگی
عہد ماضی کا نگاہوں میں سماں پھرنے لگا
لاشۂ طفلی پہ خونِ نوجواں گرنے لگا
مرتعش ہونے لگے جذبات دل کے داغ میں

لے کے پہنچا غم میرا مجھ کو اندھرے باغ میں
اس کے ایک گوشے میں جانِ زندگانی دفن ہے
میرا بچپن دفن ہے میری جوانی دفن ہے
میری زندہ آرزؤں کا وہیں مدفن بنا

آخری شعر کا دوسرا مصرعہ نامکمل ہے اور اسی طرح ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔ یہ مرثیہ پچیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری چند اشعار میں درد و کرب اور غم و یاس کی شدید کیفیت موجود ہے۔

کس طرح ہم نے سلایا جاگتی امید کو
کس طرح ہم نے بنایا ہے محرم عید کو
چاندنی راتوں میں گرمی نے ستایا کس طرح
لمبی لمبی سرد راتوں نے جگایا کس طرح
کس طرح سے ہم جیے ہیں آپ کے مرنے کے بعد
آپ تو گھر کو نہیں لوٹیں سفر کرنے کے بعد[۲۰]

اس پورے مرثیہ میں مولانا نے اپنی ذہنی تصویروں کے نقوش اور اپنے شدت غم کو شعری زبان میں پیش کیا ہے۔

تیسرا مرثیہ انھوں نے عبدالحئ اثر قاسمی کے بیٹے ممتاز احمد کی وفات پر کہا ہے۔ اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ قاضی صاحب ایک دردمند دوست کے درد کو سمجھنے والے تھے اور یہی نہیں بلکہ دوسروں کے غم کو اپنا بنا لینے کی صلاحیت ان میں موجود تھی۔ اس مرثیہ میں سات اشعار ہیں۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

آہ کہ ممتاز احمد چل بسا
دیدۂ دل کا سہارا ہائے ہائے
غرقِ طوفانِ حوادث ہوگیا
بحرِ مقصد کا کنارا ہائے ہائے
چھپ گیا دے کر جھلک اک نور کی
صبحِ طفلی کا وہ تارا ہائے ہائے

چوتھا مرثیہ انھوں نے ۱۹۵۳ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات پر کہا تھا۔ یہ

مرثیہ عربی زبان میں ہے اور اس میں گیارہ اشعار ہیں۔ ان اشعار کے ایک ایک لفظ سے کرب والم کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

فقداً یا عین جودی بالدموع السواکب
علی نعی من لیس الینا بآئب
امامٍ، جلیلٍ سیدِ عالم الوریٰ
سلیمان ملک العلم، للفضل جالب
تقیٍ، نجیبٍ عبقریٍ، سمیدعٍ
تملک کنزاً مخفیاً من مواهبٍ
خطیب، علیم، منشئٍ مورخٍ
تضلع من جمّ العلوم العجائب
فجعنا بفقدان الامامین قبله
ومن زهرة الدنیا رفعنا بجانب
ولکن "باعظم کر" توفیٰ وشبله
توفی بباکستان بین الاجانب [۲۱]

اذانِ کعبہ

"اذانِ کعبہ" قاضی صاحب کے اس مجموعۂ کلام کا نام ہے، جس میں ان کے دور طالب علمی کی نظمیں موجود ہیں۔ وہ نظمیں زیادہ تر مسجد ومدرسہ کی تعمیری سلسلے کے تحت کہی گئی تھیں۔ ان نظموں کو کچھ طالبِ علم گروپ بنا کر خوش کن آواز میں پڑھتے تھے اور کچھ باشعور لوگ گاؤں میں ایک دوسرے کے دروازے پر جا کر مترنم آواز میں پڑھتے اور خوب چندہ وصول کرتے۔ ان لوگوں میں قاضی صاحب کے استادِ محترم مولانا شکر اللہ صاحب بھی پیش پیش رہتے تھے۔ مولانا شکر اللہ صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلمانوں کے دروازوں پر صدا لگاتے اور ایک ایک نظم پر ان لوگوں سے پانچ پانچ، دس دس، ہزار روپے کی رقم جمع کرتے۔[۲۲]

قاضی صاحب کے اس مجموعۂ کلام پر علامہ انور صابریؒ نے ۱۹۵۴ء میں تقدیم لکھی جس میں ان کی تمام نظموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور ہر ایک نظم کی خوبیوں کو سراہا۔ اس مجموعہ میں کل چوبیس نظمیں ہیں، جو مسجد ومدرسہ کی غرض سے کہی گئی ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ

یہ ہیں۔

چھڑ گئی مسجد تو پھر پوری کرانی چاہیے
آب زر سے پیاس مسجد کی بجھانی چاہیے
چند پیسے کی حقیقت کیا ہے اے مردِ غنی
وقت آجائے تو گردن بھی کٹانی چاہیے
پھر سخاوت کی زباں پر ہے ترانہ جود کا
سر پہ لہراتا ہے جھنڈا ، اخروی بہبود کا
اے مسلماں ! یاد کر اسلاف کی تو داستاں
امتحاں ہوگا ابھی تجھ سے تیرے معبود کا

قطعات ومتفرقات

قاضی صاحب نے قطعات ومتفرقات بھی لکھے ہیں۔ قطعہ گوئی ان کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے اس میں ان کی شخصیت کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ قطعات ہی ان کی فن کاری کی اصل معراج ہیں۔ یہاں چند قطعات پیش کیے جاتے ہیں:

تیرتے ہیں نور کے دریا میں نغماتِ حیات
رات کے پچھلے پہر چھیڑا ہے فطرت نے رباب
دے رہی ہے درس رنگ و بو چمن کو چاندنی
نورزادے پڑھ رہے ہیں صف بہ صف سیمیں کتاب
تھم گیا ماحول کی رنگینیوں کا ارتعاش
اہتمام بزم شب کا ہوگیا پورا نصاب
رنگ و بو کی گود میں شبنم کی چادر اوڑھ کر
سو رہی ہے دامنِ گل پر عروسِ ماہتاب [۲۳]

دوسرا قطعہ اس طرح ہے:

عقل کو، روح کو، اخلاق کو، جو شل کردے
میرے نزدیک وہ تخریب ہے تعمیر نہیں
رقص ہو، نغمہ ہو، طاؤس ہو یا پھر ہو شراب
کون ان میں دلِ انساں کے لیے تیر نہیں [۲۴]

اسی طرح کے اور بھی بہت سے قطعات ہیں جن میں سماج میں پھیلی ہوئی بیماریوں، اخلاقی معایب، معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو مختلف عناوین سے قاضی صاحب کے شعری مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ عناوین یہ ہیں: مکاری، جمع اضداد، قحط بنگال، یہودی اور فلسطین، ایماں کا سودا وغیرہ۔

اس کے علاوہ درج ذیل تین نظمیں جو قاضی سلمان صاحب کے پاس سے حاصل ہوئیں۔ یہ قاضی صاحب کے مجموعۂ کلام میں شائع نہیں ہوئیں۔

معراج کی شب

ستارے آسماں پہ وجد میں ہیں رقص کرتے ہیں
زمین کے نقش خاکی ہر طرح بنتے سنورتے ہیں
فضاؤں میں تجلیات کے جلوے بکھرتے ہیں
مسلسل نور کی برسات سے ذرّے نکلتے ہیں

ہزاروں برکت و انوار سے پر آج کی شب ہے
شہ کونین عالیجاہ کی معراج کی شب ہے

وہ جس کی دید کو موسیٰ جہاں میں عمر بھر ترسے
اور ارماں بن کے قطرے دیدۂ یعقوب سے برسے
وہ جلوہ آج در آیا تماشا بن کے اس در سے
جسے تعبیر کر دیتے ہیں ہم اپنے پیمبرؐ سے

حجاب درمیانی اٹھ گیا صرف مشدّد سے
کہ وصلِ عاشقانہ ہے احد سے اور احمدؐ سے [۲۵]

یہ نظم چوبیس اشعار پر مشتمل ہے، مگر اسے ہم نے مختصر ہی نقل کیا ہے۔

مئے طہور

محبت دل میں کر لیتی ہے گھر آہستہ آہستہ
یہ دنیا ہوتی ہے زیر و زبر آہستہ آہستہ
قریب آنے لگا اب ان کا در آہستہ آہستہ
کہ خم ہوتا چلا جاتا ہے سر آہستہ آہستہ

کچھ ایسی آس سے کھینچی ہے میں نے آہ زنداں میں
کھلا جاتا ہے خود زنداں کا در آہستہ آہستہ
سبک جو ہو گئے اک وار میں وہ اور ہی ہوں گے
یہاں تو کام کرتی ہے نظر آہستہ آہستہ
اثر بے تاب ہوگا تیری ہر ہر آہِ مضطر کو
محبت کرتی ہے ناداں ! اثر آہستہ آہستہ
ہوا زنداں کی بھی ہے شعلہ افشاں جیسے اے اطہر
چلے جاتے ہیں میرے بال و پر آہستہ آہستہ[۲۶]

مقدس نغمے

گھٹا جس وقت لہرائی ہے متوالی ہواؤں میں
بہار رنگ جب آتی ہے گلشن کی اداؤں میں
ستاروں کی ضیاء ہنستی ہے جب کالی فضاؤں میں
تو پھر کالی سی کملی کی وہ رنگت یاد آتی ہے

کسی کی یاد جب آتی ہے میرے قلب محزوں میں
جلا محسوس جب کرتا ہوں اپنے بخت شب گوں میں
بپا طوفان جب ہوتا ہے دل کے قطرہ خوں میں
تو پھر اصحابؓ پیغمبرؐ کی الفت یاد آتی ہے

اتر آتے ہیں جب دل میں شبِ ظلمات کے جلوے
برس جاتے ہیں جب آنکھوں پہ کالی رات کے جلوے
مری محفل پہ چھا جاتے ہیں جب برسات کے جلوے
تو پھر صدیق کی وہ لیل ہجرت یاد آتی ہے

اُمڈ آتے ہیں جب طوفان سورج کے بیاباں میں
بکھر جاتے ہیں جب جدّت کے جذبے زور طوفاں میں
شرارے ٹوٹتے ہیں جب ہر اک ذرہ کے داماں میں
تو پھر فاروق کی وہ شامی سفارت یاد آتی ہے[۲۷]

حوالے

۱۔ زبانی معلومات، مولانا نظام الدین (اسیر ادروی)، ۲۰۰۷ء
۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، ۱۹۴۷ء، ص ۲۶۴-۲۶۵
۳۔ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، دائرہ ملیہ مبارک پور، ص ۴۱، ۱۹۸۷ء
۴۔ ماہنامہ قائد، ''نالۂ اطہر''، مراد آباد، ص ۳۱، دسمبر ۱۹۳۹ء
۵۔ مئے طہور (مجموعۂ کلام قاضی اطہر مبارک پوری)، مرتبہ قمر الزماں، چشتی کمپیوٹر پوائنٹ، مبارک پور، اعظم گڑھ، طبع اول، ص ۱۳۱، ۲۰۰۶ء
۶۔ ایضاً، ص ۱۳۸
۷۔ یہ نعت قاری انوار الحق مبارک پوری کی ایک مخدوش بیاض سے حاصل ہوئی۔ اسے قاضی صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں لکھا تھا۔ دراصل یہ نعت کافی طویل تھی، مگر اس کے بہت سے اوراق مرورِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔
۸۔ یہ نعت بھی مولانا کے بیاضِ خرد سے حاصل شدہ ہے۔
۹۔ قاضی اطہر مبارک پوری نمبر، مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، ص ۴۰، ۱۹۹۶ء
۱۰۔ قاضی اطہر نمبر، ماہنامہ ضیاء الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ، ص ۴۱۲، ۲۰۰۳ء
۱۱۔ مئے طہور (مجموعۂ کلام قاضی اطہر مبارک پوری)، مرتبہ قمر الزماں، چشتی کمپیوٹر پوائنٹ، مبارک پور، اعظم گڑھ، طبع اول، ص ۴۳۸، ۲۰۰۶ء
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۷۶
۱۳۔ مولانا کی یہ نظم بارہ اشعار پر مشتمل ہے جو ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء میں کہی گئی تھی۔ یہ نظم بھی مولانا کی مخدوش بیاض سے حاصل کی گئی ہے۔
۱۴۔ کاروانِ حیات، خودنوشت سوانح، قاضی اطہر مبارک پوری، فرید بکڈپو، دہلی، ص ۲۷، ۲۰۰۳ء
۱۵۔ ماہنامہ ''البلاغ''، بمبئی، جولائی ۱۹۵۶ء
۱۶۔ کاروانِ حیات مع قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، فرید بکڈپو، دہلی، ص ۶۸، ۲۰۰۳ء

۱۷؎ ایضاً،

۱۸؎ مئے طہور (مجموعۂ کلام قاضی اطہر مبارک پوری)، مرتبہ قمرالزماں، ص ۲۸۱، ۲۰۰۶ء

۱۹؎ ایضاً، ص ۱۵۰

۲۰؎ ایضاً، ص ۳۹۱-۳۹۴

۲۱؎ ایضاً، ص ۳۹۶-۳۹۷

۲۲؎ قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، طبع اول، دائرہ ملیہ مبارک پور، ص ۴۱، ۱۹۸۷ء

۲۳؎ ممبئی میں منعقدہ مشاعرہ ''ماہتابی بزم شہابِ سخن'' ۱۹۵۴ء میں یہ قطعات کہے تھے۔ جواب مجموعۂ کلام مئے طہور میں شامل ہیں۔

۲۴؎ یہ قطعہ حکومتِ ممبئی کی طرف سے ہفتہ شراب بندی کے اصلاحی مشاعرہ میں ۱۰/ اپریل ۱۹۵۴ء کو پڑھا گیا تھا۔

۲۵؎ روزنامہ جمہوریت، ممبئی، ۱۹۵۰ء

۲۶؎ روزنامہ انقلاب، ممبئی، ۱۹۵۲ء

۲۷؎ ایضاً، ۱۹۵۳ء

☆☆☆

باب ششم

معاصر اہلِ علم کی نظر میں
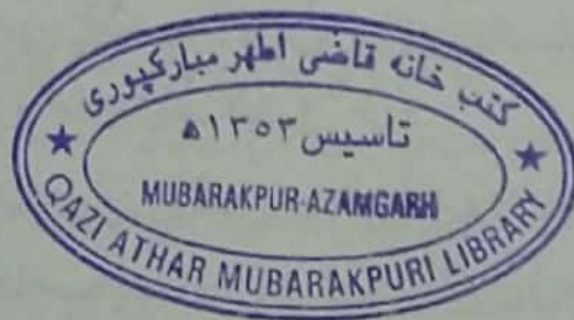
ایک مقولہ ہے ''ہم عصر ہونا باہمی منافرت کی بنیاد ہے'' یہ امر فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر معاصرین اپنے ہم عصروں کی تعریف وتوصیف میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ چاہے وہ علمی و دینی صلاحیتیں ہوں یا کوئی اور خوبی۔

لیکن جب ہم قاضی صاحب کے ہم عصروں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس امر سے مستثنیٰ نظر آتے ہیں، ان کے سلسلے میں ہر معاصر کا ذہن وقلب کشادہ اور فراخ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ قاضی صاحب کے اعلیٰ اخلاق، سخاوت و ایثار ہے جس نے ان کے معاصرین کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ خود بھی مولانا کی خوبیوں اور ان کے اعلیٰ کردار و اوصاف حمیدہ میں رطب اللسان ہوں۔

اس باب میں مولانا اطہر کی نسبت دوسروں کے خیالات وآراء کو پیش کر کے ان کے مقام ومرتبہ کا یقین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تاثرات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

☆ مرحومین کے تاثرات ☆ زندہ شخصیات کے تاثرات

☆ اداروں کے تاثرات ☆ منظوم تاثرات

مرحومین کے تاثرات

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی اپنے خیالات وجذبات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں کہ:

''قاضی صاحب نے اس ملک کی خالص اسلامی عربی تاریخ کے موضوع کو اپنی علمی وتحقیقی کاموں کا محور بنا کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ ان کی ان گراں قدر تصانیف کو اسلامی تاریخ کا بیش بہا خزانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب مؤلف اس بے آب وگیاہ صحراء میں تنہا چلے اور جب اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے تو اپنے ساتھ باغ وبہار کا پورا قافلہ لے آئے'' [۱]

مولانا مختار احمد ندوی (نگران اعلیٰ مجلّہ ''البلاغ'' ممبئی)

مولانا مختار احمد ندوی اپنے مضمون ''آہ قاضی اطہر مبارک پوری'' میں لکھتے ہیں کہ:

''قاضی صاحب ایک مثالی انسان تھے۔ صبر وتحمل ان کی عادت تھی،

تکلفات سے عاری حق گو، حق شناس اور حق پرست تھے، کسی کی پرواہ کیے بغیر اس کو ادب کے دائرے میں منہ پر ٹوک دیتے تھے۔ آپ بڑے یار باش، علماء کے قدرداں، ان کی مسکینیت پر نالاں، ان کی علمی اور مادّی ترقی کے خواہاں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے علم کا رعب کبھی نہیں جمایا اور نہ ہی اپنے خداداد علم کو دنیا کی پونجی بنائی۔ وہ علم کی جس بلندی پر تھے دنیا ان کے پیچھے پیچھے زینہ بزینہ اس سے مادّی ترقی کے مینار پر ان کو پہنچا دیتی''۔ ۲

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی جو قاضی صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''قاضی صاحب ایک بے لوث، شریف النفس اور پاک طینت شخص تھے، ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی۔ ان کا دل نرمی، مروّت، اخلاص ومحبت کا وہ آئینہ تھا جو تملق و چاپلوسی، خودغرضی، منافقت، ریا، رشک وحسد، بغض ونفرت اور کینہ وکدورت کے گرد وغبار سے زنگ آلود نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر بھی آتا تھا۔ ان کی گفتگو بناوٹ اور تصنع سے خالی ان کا عمل ظاہر داری اور نمائش کی آلائشوں سے پاک تھا۔ ان کی کسی ادا سے رعونت یا کبر کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ان کی چال، ڈھال، رفتار، گفتار، رہنے سہنے اور ملے جلنے کے انداز سے غرور وتمکنت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

قاضی صاحب بڑے فراخ دل، کشادہ قلب اور وسیع المشرب تھے۔ ان کے دل میں ہر طبقہ ومسلک اور ہر مذہب وملّت کے لوگوں کے لیے یکساں گنجائش تھی۔ تعصب، تنگ نظری، تحزب اور فرقہ آرائی کی لعنتوں نے ان کے قلب کو داغ دار نہیں کیا تھا۔

وہ ہر طبقۂ فکر اور ہر حلقۂ خیال کے لوگوں کے ساتھ نشست وبرخاست رکھتے تھے اور ان کے اصحاب ان کے فضل وکمال کی قدر کرتے، ان کو عظمت وبلندی کا نقش اور شرافت ومحبت کا جلوہ جہاں بھی دکھائی دیتا۔ اس کے سامنے بلاامتیاز فرقہ وقوم اپنی جبینِ نیاز خم کر دیتے''۔ ۳

زندہ شخصیات کے تاثرات

مولانا نظام الدین اسیر ادروی

مولانا اسیر ادروی "من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"قاضی صاحب دور حاضر میں اپنے مخصوص موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ہر بات سند تھی۔ اہلِ علم میں فراخ دلانہ اعتراف کا جذبہ اگر ہے تو ان میں سے کوئی بھی قاضی صاحب کے اس بلند علمی مقام سے انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس موضوع میں تقدس و پاکیزگی کے عنصر کا اضافہ کرتی ہیں۔"

مزید لکھتے ہیں کہ:

"قاضی صاحب انتہائی وضع دار بزرگ تھے جن لوگوں سے تعلق قائم کرتے اسے زندگی بھر نبھاتے۔ مصنوعی زندگی سے نا آشنا تھے اور علمی مجلسوں میں کسی سے مات کھانے والے نہیں تھے، لیکن بے تکلف احباب کی محفل میں شرافت و اخلاق کا مجسمہ تعلّی اور خود نمائی کا کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا تھا"۔[۱]

نعیم صدیقی صاحب

نعیم صدیقی نے قاضی صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں:

"جب قاضی صاحب سے پہلی بار غالباً ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں ملا تو پہلے ہی دیدار میں ان کی غیر معمولی سادگی و بے تکلّفی، اعلیٰ ظرفی، ذرہ نوازی اور اس کے ساتھ عالمانہ تبحر، منصفانہ بصیرت، وسعتِ مطالعہ اور دقیقہ رسی کے جو گہرے نقوش میرے دل پر مرتسم ہوئے وہ علم و شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ برابر ارتقا پذیر رہے۔ اسی وجہ سے میں کئی دہائیوں میں انھیں اس حیثیت سے منفرد مقام دیتا ہوں۔ ایسی

نظیریں خال خال ہی مل سکتی ہیں۔ جو سیرت و کردار کی اس ہمالیائی بلندی کے ساتھ تبحر علم اور تصنیفی صلاحیتوں کے اتنے اعلیٰ مقام کی حامل ہو۔

قاضی صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند ہے اس میں ظاہر و باطن کی کوئی تفریق نہیں ان کے یہاں منافقت اور تضاد کی کوئی گنجائش نہیں اسی وجہ سے وہ دوسروں کی مصلحت پسندی اور منافقت کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ سچی اور حق بات تنہائی میں ہی نہیں، بھری محفل میں رو برو بھی کہہ دیتے تھے۔ ان کا لباس، غذا، انداز تکلّم، طرز تخاطب سب سادگی کی مکمل تصویر ہیں''۔ ۵

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مولانا قاضی صاحب کی علمی لیاقت وصلاحیت کو سراہتے ہوئے پروفیسر محسن عثمانی ندوی رقم طراز ہیں:

''وہ علم و تحقیق کے دریا کی شناوری اور غوّاصی کر کے موتی نکال کر لائے اور علم کی دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔ انھوں نے پریشانی کے دور میں بھی سفینۂ عزم کو دریائے عمل میں اتارا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس شعر کے مصداق تھے۔

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانشِ افرنگ ۶

مولانا محمد الیاس ندوی، بھٹکلی

مولانا محمد الیاس ندوی نے ''ملّت کا ایک خاموش خادم'' کے عنوان سے اپنے جذبات کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح بکھیرا ہے:

''مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارک پوری نے حدیث و تاریخ کے میدان میں اپنی غیر معمولی خدمات کے ذریعے پوری دنیا میں اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ اپنے گھر کے محدود کتب خانہ کی روشنی میں بے شمار تصانیف لکھ کر وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صف میں شامل

ہوگئے۔ ملت کا یہ خاموش خادم اپنی بے لوث خدمت سے
مسلمانوں کے سماجی مسائل سے بھی غافل نہیں رہا۔
ملت کے مسائل کو حل کرنے میں وہ پرسنل لاء بورڈ، ندوۃ العلماء لکھنؤ
اور دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے رکن انتظامی کی حیثیت سے آخر تک
دوسرے اکابر علماء کے ساتھ اس میں شریک رہے۔ یقیناً ان کی
خدمات آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہیں''۔[7]

مولانا فضلِ حق خیرآبادی

حدیثِ نبوی ''اذکروا محاسن موتاکم'' سے اپنے تأثرات کی ابتداء کرتے ہیں۔
پھر لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب ایک مؤرخ تھے، تاریخِ اسلام ان کا خاص موضوع
تھا۔ اور دنیا انھیں اسی حیثیت سے جانتی پہچانتی تھی۔ ان کی تصانیف،
مضامین اور مقالات پڑھنے سے طبیعت میں ایک طرح کا نشاط اور
کیف محسوس ہوتا ہے اور دامن و دماغ تاریخی لعل و جواہر سے مرصّع
نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں قلم کی شوخیوں اور رنگینیوں کے بجائے
سنجیدگی کی فراوانی اور حقائق سے درافشانی ہے۔''

آخر میں لکھتے ہیں کہ:

''قاضی صاحب نے اسلامیات کے ذخیروں سے کیسے کیسے قیمتی
موتیوں کو چن کر اکٹھا کر دیا ہے، جو اہلِ علم و دانش کے لیے نایاب و کم
خواب کی حیثیت رکھتے ہیں''۔[8]

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی قاضی صاحب کے بارے میں اپنے خیالات اس
طرح پیش کرتے ہیں:

''علماءِ ہند میں قاضی صاحب کو یہ شرف و مجد حاصل ہے کہ ہندوستان
کی اسلامی تاریخ و ثقافت اور یہاں کے طبقات و رجال پر جس وسیع
پیمانے پر انھوں نے کام کیا ہے۔ مولانا سید عبدالحئی حسنی صاحب

(نزہۃ الخواطر) کے علاوہ اس باب میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ ہندوستان کی جب کبھی علمی تاریخ لکھی جائے گی تو بلاشبہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی علمی سرگرمیوں کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا۔''

اپنے تاثرات کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما [9]

واصل عثمانی

جناب واصل عثمانی قاضی صاحب کو ''عالم دین اور مؤرخِ اسلام'' کے لقب سے نوازتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب نے جن حالات اور ماحول میں وہ علمی کارنامے پیش کیے ہیں اب ان کا ثانی، جانشین ملنا ناممکن ہے۔ آپ عربی وفارسی میں بڑی دست گاہ رکھتے تھے، خاص طور سے عربی میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی، آپ بڑے ذی علم، قابل اور جامع صفات انسان تھے، تمام عمر کتب خانوں کی سیر، کتابوں کا مطالعہ کیا، آپ کی عقابی نگاہیں علوم ومعارف کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں کہ استعجاب سے نگاہیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں۔ پتھر سے ہیرا تراشنے کا کام ان کو خوب آتا تھا، انھوں نے اسلامی تاریخ وتحقیق پر بڑے عالمانہ انداز سے کام کیا، روایات کو درایت کی میزان پر تولنے اور کھوٹے کھرے کو پرکھنے کا کام کاش کوئی ان سے سیکھتا۔ آپ کی اکثر تصانیف پی۔ایچ۔ڈی کے وقیع مقالہ جات پر بھی فوقیت رکھتی ہیں۔ آپ کی تصانیف سے ان علمی ذخائر کا بھی علم ہوتا ہے جو مخطوطات، مسوّدات اور نوادرات کی شکل میں بھی کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ صحافت، ادب، تاریخ، تحقیق کے دانش وروں کی محفل ہو کہ اولیاء اللہ اور درویشوں کی مجلس ہر جگہ آپ کو عقیدت و محبت سے دیکھا جاتا ہے''۔[10]

مولانا عبدالعظیم ندوی

مولانا عبدالعظیم ندوی کی نگاہوں میں ''قاضی صاحب برصغیر ہندو پاک کے معروف مؤرخ اسلام، عرب و ہند تعلقات کے رمز شناس، عظیم اسکالر، کامیاب مصنف و محقق نے جوانی ہی میں کثرتِ مطالعہ کی فریفتگی میں قدرت کو آنکھوں کی روشنی کا بڑا حصہ دے کر اس کے عوض علم کی لازوال دولت حاصل کی ان کے تعلیمی ایام کی جہد مسلسل اور تنگ دامنی میں متقدمین کی جھلک اور سچی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتابوں کے صفحات میں جتنے بڑے نظر آتے ہیں روزمرّہ کی زندگی اور عام مجلسوں میں اس کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ قاضی صاحب کا وصفِ خصوصی اور طرّہٗ امتیاز کفایت شعاری وسادگی تھا''۔ ۱۱

مولانا مسعود سعید الاعظمی

مولانا مسعود سعید الاعظمی، مدیر 'المآثر' قاضی صاحب کے بارے میں اپنے تأثرات اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''قاضی صاحب کی طبیعت میں بہت ندرت تھی اور اس کا اثر تھا کہ وہ نادر عنوانات کا بھی انتخاب کرتے تھے، یا اگر عام عنوانات کو بھی اٹھاتے تو ان کے اندر ندرت آمیز معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیتے اس پر مستزاد یہ کہ خالص علمی و تحقیقی باتوں کو ایسے عام فہم، سادہ، سلیس اور رواں دواں زبان میں سپردِ قلم فرماتے کہ کہیں کوئی الجھاؤ نہ ہوتا۔
>
> قاضی صاحب خالص علم و تحقیق کی دنیا کے آدمی تھے اور اس میں ان کی جولانئ فکر و طبع کو اپنے لیے موضوع تلاش کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دنیا میں اپنے علم و فکر کے ذریعے علمی خدمات انجام دیں''۔ ۱۲

مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی

مولانا مطیع الرحمٰن صاحب اپنے خیالات کو لفظوں کے موتیوں میں اس طرح پروتے ہیں:

> ''جولائی ۱۹۹۶ء کو علم و فن اور تحقیق و تصنیف کی دنیا میں نصف صدی تک رنگ و نور بکھیرنے والا ایک اور آفتاب غروب ہوگیا۔ حسنِ

اخلاق، بے باکی، اخلاص ومحبت اور جہد وعمل کے ایک پیکرِ مجسم نے
اس جہانِ فانی کوالوداع کہا۔ جس کے نفسِ گرم سے علمی مجالس میں
رونق اور جس کی روشنی وتابانی سے دنیائے علم میں تابانی تھی۔ جس
نے اپنا خونِ جگر پگھلا کر علم وتحقیق کے چراغ جلانے اور ہندوستان کی
اسلامی تاریخ کے گمنام گوشے روشن کیے۔
قاضی اطہر صاحب نے قرآن وحدیث، تذکرہ وسوانح اور تاریخ کے
موضوع پر کافی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جو ان کے وسعتِ علم اور
زورِ تحقیق کی آئینہ دار ہیں۔ خصوصاً عرب وہند کے تعلقات پر شائع
شدہ ان کی کتابیں ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ جو اس بات کا
ثبوت دیتی ہیں کہ قاضی صاحب علم کے آبشار اور استقامت کے
پہاڑ تھے۔ اور وہ سمندر کی تہوں سے موتی نکال لاتے تھے۔ وہ ملت
کے مسائل سے بھی حد درجہ متاثر تھے۔ خصوصاً علم کی ناقدری پر بہت
سوچتے۔ فکر مند رہتے، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ عجم کے حسن طبیعت اور
عرب کے سوز دروں کی ایک تصویر تھے۔ ان کی طبیعت باغ و بہار
تھی۔ جس مجلس میں بیٹھتے اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے۔ غرضیکہ وہ
استغناء، کفایت شعاری اور صبر جمیل کا مجسّمہ تھے، وہ علم کے ایسے بحر
ناپیدا کنار تھے کہ برصغیر کے بڑے بڑے علماء دانشوران، محققین و
ادباء ان کو اپنے فن میں یکتا سمجھتے تھے"۔ [۱۳]

مولانا ظفر احمد صدیقی (پروفیسر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

مولانا ظفر احمد صدیقی اپنے مضمون "قاضی صاحب بحیثیت مؤرخ ومصنف"
میں لکھتے ہیں:

"فاضل اجل وعالم بے بدل حضرت مولانا قاضی ابوالمعالی عبدالحفیظ
اطہر مبارک پوری ایمان اور عمل صالح کی جامعیتِ علمی وتصنیفی
مشاغل اور سادہ متواضع سیرت وشخصیت کے لحاظ سے بلاشبہ سلفِ
صالحین کی نظیر تھے۔ دیار پورب، خطۂ اعظم گڑھ اور سرزمین مبارک

پوران پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔ان کی تصانیف و مقالات عالم اسلام کے کتب خانہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ ناساعد حالات، ناسازگار ماحول اور بے سروسامانی کے باوجود انھوں نے جو بلند پایۂ علمی کارنامے انجام دیے ہیں وہ تحقیقی و تصنیفی اداروں کے ان ارکان اور بڑے بڑے مراکز علمی کے ان وابستگان کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں جو "وادیٔ غیر ذی زرع" کی عملی تفسیر ہیں"۔

مزید فرماتے ہیں:

"قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی تعین قدر اور تجزیہ و تبصرہ کے لیے وسیع علم، غائر مطالعہ اور کم از کم ایک مکمل کتاب کی وسعت درکار ہے"۔ ۱۴

محمد سلمان منصور پوری

مولانا محمد سلیمان منصور پوری نے "تکلف و تصنع سے مبرا تواضع و ایثار کا پیکر" کے عنوان سے قاضی صاحب کے بارے میں لکھا ہے:

"قاضی صاحب کی علمی استعداد اتنی زیادہ تھی کہ ذرا سی تاریخی گفتگو چھیڑ دیں معلومات کے سمندر کی موجیں جوش میں آجائیں۔عربی کے اشعار اور ان کے معنی بیان کرنے پر آجائیں تو دیوان کے دیوان سنا ڈالیں۔ اسماء الرجال پر تحقیق کی ٹھان لیں تو بال کی کھال نکال دیں۔علم کی شان ان کے چہرے بشرے سے عیاں تھی۔ طبعی تواضع ایثار و قربانی، خورد نوازی اور بے تکلفی کے عناصر اربعہ سے گویا ان کا وجود مل کر بنا تھا، ان کی سادگی دیکھ کر یہ یقین دشوار ہوتا تھا کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور ہندو عرب تعلقات پر مستند رائے رکھنے والے اور ان موضوعات پر تصنیفات کی شکل میں امت کو انمول شہ پارے عطا کرنے والے عظیم مؤرخ اور مصنف یہی ہیں"۔ ۱۵

ڈاکٹر شرف الدین ساحل

شرف الدین ساحل قاضی صاحب کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار یوں

کرتے ہیں:

''قاضی صاحب اپنے وقت کے ایک زبردست اسلامی اسکالر، مؤرخ اور محقق تھے۔ بحر تحقیق میں غوطہ زنی کرکے نئے نئے موتی نکالتے تھے۔ انھیں درس وتدریس، صحافت وادب، تصنیف وتالیف سے حد درجہ مزاولت تھی ان کی پوری زندگی انھیں سرگرمیوں کی نظر ہوئی۔ ان کی بامقصد زندگی میں اخلاص وقربانی کے سوا کچھ نہیں تھا، سادگی، انکساری، بردباری اور بے نیازی ان کی شخصیت کے جوہر تھے''۔ ۱۶

قمر سنبھلی

قمر سنبھلی صاحب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے تاریخ، سیرت، سوانح، تحقیق، حدیث وتفسیر اور اصول حدیث جیسے اہم موضوعات پر یادگار علمی کارنامے انجام دیے۔ وہ سادگی، خلوص اور بے نیازی میں اسلاف کی یادگار تھے''۔ ۱۷

محمد اسحٰق (لکچرر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)

محمد اسحٰق صاحب کی نظر میں قاضی صاحب ان عبقری شخصیات میں سے تھے، جنھوں نے تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، سیرت، تذکرہ اور سوانح جیسے موضوعات پر بیش بہا تحقیقی کام کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''قاضی اطہر مبارک پوری کی زندگی اور ان کے کارناموں پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کی ایسی منصوبہ بندی کی جس سے زیادہ، اچھے اور نیک اعمال صادر ہوسکیں۔ ان کی تصنیفات اور ان کے مقالات عرصے تک علم کی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

آخر میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا مشہور قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے''۔ اسی طرح قاضی صاحب اپنی تصانیف سے پہچانے جاتے ہیں''۔ ۱۸

مولانا اعجاز احمد اعظمی

مولانا اعجاز احمد جو ماہنامہ 'ضیاء الاسلام' کے سرپرست ہیں، قاضی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ حقیقی معنی میں صاحب تحقیق تھے۔ وہ بڑی دقتِ نظر سے مطالعہ کرتے اور اپنے کام کی باتیں چن لیا کرتے تھے۔ وہ فن کی بنیادی کتابوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ کثرتِ مطالعہ اور ذوقِ تحقیق نے ان میں ایسا ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ کارآمد اور زائد باتیں خود بخود ممتاز ہوتی چلی جائیں، وہ ایسی جگہوں سے اپنے مطلب کی باتیں اخذ کر لیتے ہیں جہاں تک عام ذہنوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ ان کا علم اتنا متحضر تھا کہ اک ذرا چھیڑیے تو سمندر سا کن میں تموج پیدا ہو جاتا''۔ ۱۹

مولانا افضال الحق جوہر قاسمی، اعظمی

مولانا افضال الحق نے قاضی طہر مبارک پوری کی ایک ایک خوبی کا بڑی باریکی سے جائزہ لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب کو قدرت نے نوازا اور خوب نوازا۔ سادگی دے دی تو مصنوعی حسن سے بیزار کر دیا۔ عقل عطا کی تو مال داروں سے بے نیازی بخش دی۔ دین دیا تو دنیا داراوں کا پیوند نہیں لگایا۔ علم دیا تو تجارت کے گر نہیں سکھائے، انفرادیت کا جوہر عطا کیا تو کبر و غرور کی گرد اس پر نہیں جمنے دی۔

آگے لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب ایسے انسان تھے جو تاریخ اسلام کی ایسی وادی میں گئے جہاں کوئی نہیں گیا تھا، پھر وہاں ایسے چار چاند لگا کر واپس آئے کہ دوسرا پانچواں چاند نہیں لگا سکتا۔ قاضی صاحب کی انفرادیت کا سب سے بڑا عنصر ان کی مہم جوئی، ژرف نگاہی اور بے پناہ محنت تھی۔ ان تینوں عناصر نے ان کو خلوت پسند اور خاموش کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اصحابِ کہف کے غار میں چھپ کر رہے لیکن سوتے نہیں جاگتے

رہے اور اپنی حوصلہ مندی سے وہ کارنامے انجام دیتے رہے جن کے لیے قدرت نے انھیں تراشا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا آزاد کی طرح یہ بھی اپنی نظم ونثر، اسلوب وآہنگ کے خالق اور خاتم تھے اور اپنے فن کے موجد بھی"۔[۲۰]

اصغر مجاہد (سکریٹری تنظیم فکرونظر سندھ پاکستان)

جناب اصغر مجاہد قاضی صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"حضرت قاضی صاحب برصغیر پاک وہند کے سب اہلِ علم، اہل فکرو نظر، مؤرخ، محقق، آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے 'مسلمانوں کی عظمت رفتہ" کو جس طریقے سے اجاگر کیا ہے مسلمانوں کا تابناک و شاندار ماضی چاندوسورج سے بھی زیادہ روشن نظر آرہا ہے۔ دنیا کے چاندوسورج ابھرتے وڈوبتے رہیں گے۔ مگر آپ کا روشن کیا ہوا محققانہ سورج رہتی دنیا تک یونہی چمکتا رہے گا۔ خشک دسوکھے ہوئے ذہنوں کو آب حیات کی طرح سیراب کرتا رہے گا، یہ علم وادب کی ایسی روشنی ہے، جو کبھی ماند نہیں پڑتی۔ آپ کا تاریخ انسانیت پر عموماً اور تاریخِ اسلام پر خصوصاً بڑا احسان اور قرض ہے۔ جو اتارے نہیں اترے گا۔ مگر ایک صورت میں یہ قرض اتر سکتا ہے کہ آپ کی سب کتابوں کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے تا کہ مسلمانوں کی تاریخ عزیمت سے مسلم تو کیا غیر مسلم بھی باخبر ہو جائیں۔ بلا مبالغہ آپ تاریخِ انسانیت اور تاریخ اسلام کے محسن ہیں"۔[۲۱]

اداروں کے تاثرات

ناقابلِ تلافی خسارہ

ترجمان دارالعلوم نئی دہلی میں ادارہ کی طرف سے درج بالا عنوان کے تحت قاضی صاحب کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے:

''قاضی صاحب ہمارے بزرگ علماء کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے، جن کا اوڑھنا، بچھونا صرف علم وتحقیق تھا۔ جنھوں نے خود کو علم کے لیے فنا کر ڈالا اور نہ کبھی ستائش کی تمنا کی اور نہ صلہ کی پروا۔ وہ ایک ایسے بلند پایہ مصنف ومحقق تھے جن کے فنا فی العلم، وسعتِ مطالعہ، دقت نظر اور علم وفن کی دشوار گذار وادیوں میں پیہم اور بے تکان سفر کو دیکھ کر علامہ ذہبی، ابن حجر عسقلانی، شہرستانی اور ابن خلکان جیسے عباقرہ اسلام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جنھوں نے اپنی بے مثال علمی وتحقیقی خدمات سے اسلامی کتب خانہ کو مالا مال کیا اور پامال راستوں پر چلنے کے بجائے نئی نئی راہیں اختیار کر کے علم وفن کے نئے گوشے اجاگر کیے اور نئی نئی تحقیقات علمی دنیا کے سامنے پیش کیں۔

تاریخ اسلام بالخصوص عرب وہند کے تعلقات پر قاضی صاحب نے جو کام کیا وہ ان کا منفرد اور بے مثال کارنامہ اور عمیق وپیہم مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ان کی گراں قدر تصنیفات نے نہ صرف ہند وپاک کے اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کیا بلکہ عالم اسلام اور علماءِ عرب نے بھی ان کی علمی وجاہت کا بجا طور پر اعتراف کیا اور ان کی تصنیفات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

قاضی صاحب تاریخ کے ان رجال کار میں سے تھے جو اپنی دنیا اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرتے ہیں۔ انھوں نے جن ناسازگار حالات میں اپنا علمی سفر شروع کیا اور جس طرح انتھک جدّ وجہد، جاں فشانی سے

ناکامیوں کو کامیابی سے بدل کر علم و تحقیق کے اعلیٰ ترین مدارج طے کیے اس کی روداد انتہائی سبق آموز ہمارے لیے ایک نمونہ ہے۔ ان کی قناعت پسندی اور کردار کی پختگی لائقِ رشک و تقلید تھی۔ صفِ اوّل کے ممتاز علماء و محققین میں شمار ہونے کے باوجود ان میں علمی پندار اور لوعائیت کی بو تک نہیں تھی۔ تواضع و خاکساری کا یہ عالم تھا کہ ان سے بے تکلف ہونے کے لیے صرف ایک ملاقات ہی کافی تھی"۔۲۲

منظوم تاثرات

مولانا محمد عثمان معروفی

حبیب قطعہ تاریخ

وفات تیری یہ قاضی اطہر بھلا سکے گا نہ چرخ دوراں

تو آسمان علوم وفن کا عجیب تھا نیر درخشاں

تو اک شاعر تو اک صحافی تو اک مصنف تو اک مدرس

عظیم اک انجمن تھا تنہا عجیب اک دیدہ ور تھا انساں

تعلق ہند اور عرب ہے تری کتابوں کا خاص موضوع

عظیم اسلام کا مؤرخ کہ اک ملت ہے جس پہ نازاں

تیرے تدبر ترے تعمق پہ خود ہیں شاہد تیری کتابیں

تو اک علامہ زماں تھا عجم ہے نازاں عرب ثنا خواں

یقین آیا یہ تیری رحلت سے موت عالم ہے موت عالم

لحد منور ہو تیری جس پر ہو رحمت حق مدام باراں ۲۳

عبدالوحید قاسمی

قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی یاد میں یہ نظم لکھی ہے جس میں ان کی ہر ایک خوبیوں اوران کی تصنیفات کو سراہا ہے۔ یہ پوری نظم اٹھارہ اشعار پر مبنی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تاثرات دل

نقیب موسم گل تھا متاع عزت تھا

وہ دور شوکت واقبال کی علامت تھا

گزر گیا وہ سریر آرائے علم و حکمت تھا

وہ فخر دین کا پروردہ فخر ملت تھا

ادیب و شاعر و راز آشنا و نکتہ داں

خطیب و عالم و فاضل، مؤرخ دوراں

ادب کے گیسوئے پیچاں سدھارنے والا
غزل کی زلف پریشاں سنوارنے والا
وہ علم و فن کا نگہبان تھا زمانے میں
وہ عہد ماضی کی پہچان تھا زمانے میں
پیامِ نو تھا ہر اک فن کے راہ رَو کے لیے
خدا تعالیٰ انعام نسل نو کے لیے
اب اپنے خواب کی تعبیر کون لکھے گا
ہمارے عہد کی تاریخ کون لکھے گا
حسین پھول تھا وہ ایک باغ امت کا
یہ کس ہوا نے بجھایا چراغ امت کا [۲۴]

ایوب مبارک پوری

یہ نظم ایوب مبارک پوری نے لکھی ہے۔اس میں قاضی صاحب کی صفاتِ حسنہ اوران کی تمام تصانیف کی خوبیوں کواس طرح منظوم کیا ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوریؒ

اے مؤرخ اے مبارک پور کے نورِ نگاہ
اے سراپا علم و دانش فکر وفن کے بادشاہ
اے ادیب عصرِ نو پروردۂ دارالقضاء
مصر کے بازار میں چلتا ہے سکّہ آپ کا
باریاربی ''آم'' کی ملک رطب تک ہوگئی
آپ کے افکار کی شہرت عرب تک ہوگئی
قلب ظلمت میں جلایا یوں صحافت کا چراغ
دم زدن میں ہوگئی روشن فضائے ''البلاغ''
ہے رجال ''ہند و سند'' اہل نظر کے سامنے
ہے ''مآثر'' اور ''معارف'' بھی بشر کے سامنے

عقدۂ ''عقد ثمین'' حل کر کے پانی کردیا
ہر ورق کو مائل جادو بیانی کردیا
وادئ تاریخ میں بہتا ہے دریا نور کا
تذکرہ ہے خوب علماء مبارک پور کا
بانئ انصار کی خدمت عظیم الشان ہے
دخترانِ قوم پر یہ آپ کا احسان ہے لے

ساغرادروی

یہ تاثراتی نظم مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی عظمتوں اور اعلیٰ صلاحیتوں سے متأثر ہوکر قلم بند ہوئی جس میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ ان کی معرکہ آرا تصانیف کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

تیری عظمت کو سلام

ہے نگاہوں میں ابھی تک ضوفشاں تیرا جمال
کیسے بھولے گا جہاں تیرا ہنر تیرا کمال
دل کو تڑپانے لگا ہے، ہر نفس تیرا خیال
کیسے ہم پائیں گے؟ تجھ کامل سخنور سا کوئی
ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے؟ قاضی اطہر سا کوئی
تھا جہانِ علم و فن میں تو بڑا ہی نامور!
شخصیت تیری رہی ہر طرح بن کر معتبر!
تو رہا شہرِ ادب میں صورتِ لعل و گہر!
تھا تیرے ہاتھوں میں تہذیب و تمدن کا علم!
کس قدر بے باک اور حساس تھا تیرا قلم!
تو ہمیشہ ہی رہا اسلام کا بن کر نقیب
طالبانِ علم و فن کے تجھ سے جاگے ہیں نصیب
تو مدبّر اور شاعر تو مفکّر اور ادیب
اہل دانش میں سدا ہوتا رہا تیرا شمار

علم کی دنیا میں ہیں تیری کتابیں شاہ کار
ہے زمانے میں تیری ہر اک صفت سامنے
تیری کوشش تیری کاوش تیری محنت سامنے
ہے ''رجال السند'' کی روشن عقت سامنے
تو نے رکھی ہر گھڑی علماء و فقہاء پر نظر
صرف کر کے تو نے اپنا ''خونِ دل'' خونِ جگر
لکھ دیے تو نے یہاں حالات ان کے سر بہ سر
ہند میں تشریف لائے جو محدث تابعین
اک رسالہ ہے تیرا، عربی میں العقد الثمین

اسی طرح پورے اشعار میں تصانیف کا تعریفی سلسلہ جاری ہے، آخری شعر میں لکھتے ہیں کہ:

اے ''خدائے علم و دانش'' تیری حکمت کو سلام
کہہ رہا ہے ''تیرا ساغر'' تیری رفعت کو سلام
اے مؤرخ قاضی اطہر تیری ''عظمت'' کو سلام
روشنی جس کی نہ ہو زائل تو وہ خورشید ہے
مر کے بھی تو اس جہاں میں زندۂ جاوید ہے

حوالے

۱۔ مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی، خلافت عباسیہ اور ہندوستان ''مقدمہ''،ص ۵۵۹،

۲۔ مختار احمد ندوی، آہ قاضی اطہر مبارک پوری، مجلّہ البلاغ، ممبئی، ص ۶۵، ۱۹۹۶ء

۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ ضیاء الاسلام، ص ۲۸۵ تا ۲۸۶، ۲۰۰۳ء

۴۔ مولانا نظام الدین اسیر ادروی، من قاش فروشی دل صد پارۂ خویشم، مجلّہ ترجمان الاسلام، بنارس، اکتوبر تا مارچ، ص ۲ تا ۸، ۱۹۹۶ء-۱۹۹۷ء

۵۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی صاحب میری نظر میں''، ص ۲۹۹ تا ۳۰۰، ۲۰۰۳ء

۶۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ہفت روزہ ہماری زبان، ''قاضی اطہر مبارک پوری کی یاد میں''، مطبوعہ ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی، ص ۸، ۲۰۰۵ء

۷۔ مولانا محمد الیاس ندوی، الاتحاد، ''ملت کا ایک خاموش خادم''، ص ۱۵، ۱۹۹۶ء

۸۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہر مبارک پوری اور دفاعِ اسلامی''، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱، ۲۰۰۳ء

۹۔ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، ماہنامہ دار العلوم دیوبند ''حرفِ آغاز''، ص ۱۲-۱۳، اگست ۱۹۹۶ء

۱۰۔ واصل عثمانی، ماہنامہ علم وادب، ص ۴، اگست ۱۹۹۶ء

۱۱۔ عبد العظیم ندوی، اداریہ قاضی اطہر مبارک پوری، ماہنامہ ریاض الجنۃ ص ۳، ۷، اگست ۱۹۹۶ء

۱۲۔ مولانا سعود سعید الاعظمی، ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''مجلّہ البلاغ اور قاضی اطہر کی خدمات''، ص ۲۱۰، ۲۰۰۳ء

۱۳۔ مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی، ایضاً، ''قاضی اطہر مبارک پوری بحیثیت مربی و معلم''، ص ۳۰۵-۳۱۳، ۲۰۰۳ء

۱۴۔ مولانا ظفر احمد صدیقی، ایضاً، ''قاضی صاحب بحیثیت مورخ و مصنف''، ص ۱۸۸، ۲۰۰۳ء

۱۵۔ محمد سلمان منصور پوری، ایک قلمی مخطوطہ، سلمان مبشر صاحب کے پاس سے دریافت ہوا، ۲۰۰۸ء
۱۶۔ شرف الدین ساحل، یہ قلمی ہے ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔
۱۷۔ قمر سنبھلی، قومی آواز، ص ۳، جنوری ۱۹۹۷ء
۱۸۔ محمد اسحٰق، حیاتِ نو، بلریا گنج اعظم گڑھ، ص ۲۱ تا ۲۲، ۱۹۹۶ء
۱۹۔ مولانا اعجاز احمد اعظمی، ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''مولانا قاضی اطہر مبارک پوری- نقوش وتأثرات''، ۲۵۳، ۲۰۰۳ء
۲۰۔ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی، ماہنامہ ضیاء الاسلام، ''قاضی اطہر مبارک پوری- فکروفن''، ص ۲۴۰-۲۴۱، ۲۰۰۳ء
۲۱۔ اصغر مجاہد، ماہنامہ ضیاء الاسلام، قاضی اطہر معاصر اہم علم کے خطوط کے آئینے میں، ص ۳۹۲، ۲۰۰۳ء
۲۲۔ اداریہ، ترجمان دار العلوم، نئی دہلی، ص ۳، ۴، ۱۹۹۶ء
۲۳۔ مولانا محمد عثمان معروفی، سخن مطبوع، ترجمان دار العلوم، دہلی، ص ۳۸، ۱۹۹۶ء
۲۴۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علماء، (جدید ایڈیشن)، نظم عبد الوحید قاسمی، البلاغ پبلیکیشنز ابو الفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
۲۵۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، علی وحسین، نظم ایوب مبارک پوری، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، ص ۲۹۲، ۲۰۰۷ء
۲۶۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، آسودگان خاک، نظم ممتاز احمد ساغر ادروی، قاضی اطہر اکیڈمی، مبارک پور، اعظم گڑھ، ص ۲۸، ۲۰۰۹ء

☆☆☆

کتابیات

ابوالحسن علی ندوی، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، بدون سنہ
ابوالحسن علی ندوی، المسلمون فی الہند، المجمع الاسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء
ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، جلد چہارم لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس، اشاعتِ اول، ۱۹۸۰ء
ابوالحسن علی ندوی، ہندوستانی مسلمان، مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء
ابوالکلام آزاد، تذکرہ، پاکستان ٹائمز، لاہور، ۱۹۱۹ء
ابوسلیمان شاہجہاں پوری، مولانا حفظ الرحمٰن ایک سیاسی مطالعہ، ۲۰۰۱ء
اسیرادروی، تاریخ جمعیۃ علماءِ ہند، محبوب پریس، دیوبند، ۱۹۴۳ء
اسیرادروی، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار، آزاد پریس، دیوبند، ۱۹۸۱ء
اصغر عباس، سرسید کی اردو صحافت، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۵ء
الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۸۰ء
انوارالحسن شیرکوٹی، حیاتِ اماد، طبع اول، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن، کراچی، ۱۹۶۵ء
تاراچند، تاریخ تحریک آزادئ ہند، اول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء
تقی الدین ندوی، محدثینِ عظام اوران کے علمی کارنامے، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۶ء
جعفر حسین، ہندوستانی سماجیات، انجمن ترقی اردو ہند، باراول ۱۹۵۵ء
حبیب الرحمٰن جگدیش پوری، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، جامعہ اسلامیہ بنارس، ۱۹۷۶ء
حبیب اللہ، اعظم گڑھ کا علمی، ادبی اورتاریخی پسِ منظر، نیوروبی پریس، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء
خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۴ء
خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی ۱۹۵۷ء، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، ۱۹۵۹ء
رشید احمد اعظمی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظیم اوران کی علمی خدمات، شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۰۷ء
رئیس احمد جعفری، علی برادران، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۳ء
سعید احمد، مسلمان کا عروج وزوال، جید ترقی پریس، دہلی، ۱۹۴۲ء

سلطان اصلاحی، ہندوستان میں مدارسِ عربیہ کے مسائل، علی گڑھ، ادارۂ علم وادب، ۱۹۹۶ء
سلمان منصور پوری، سفرنامہ حجاز، کانشی رام پریس، لاہور، ۱۹۲۴ء
سہیل اقبال، کلیاتِ سہیل، لمیٹڈ کلاسس روڈ ممبئی، اشاعتِ اوّل، ۱۹۸۸ء
سید ابوالاعلیٰ مودودی، تحریک آزادی اور مسلمان، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۶۸ء
سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع ثانی، ۱۹۷۰ء
سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء
سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہازرانی، اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن ممبئی، باردوم ۱۹۵۸ء
سید عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، یونین پریس دہلی، ۱۹۶۵ء
شاہ معین الدین احمد ندوی، حیاتِ سلیمان، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء
شعیب احمد، پروانۂ چراغ، مزار خودیم ما، (حکیم محمد اسحٰق)، جمال پریس، دہلی، ۱۹۷۵ء
شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، فیروز سنز لاہور، ۱۹۵۸ء
صفی الرحمٰن مبارک پوری، الرحیق المختوم، فوٹو آفسیٹ پرنٹرس، بلیماران، دہلی، ۱۹۸۸ء
طفیل محمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، کتب خانۂ عزیزہ، دہلی، ۱۹۴۵ء
عابدہ سمیع الدین، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، لبرٹی آرٹ پریس، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
عبدالغفار، جامعہ کی کہانی، مکتبہ جامعہ نگر، نی دہلی، ۱۹۶۵ء
عبیداللہ قدسی، آزادی کی تحریکیں، طبع اول، مطبع کمبائن پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۸ء
عدیل عباسی، تحریکِ خلافت، رنگ محل پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، (بدون سن)
عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ایمان پرنٹرز، لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۹ء
عمر الدین محمد، سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر (مضمون)، علی گڑھ تحریک، ۱۹۶۰ء
فضل حق خیر آبادی (علامہ)، باغی ہندوستان، المجمع الاسلامی، فیض العلوم محمد آباد، ۱۹۸۴ء
قاری محمد رضوان اللہ، مولانا انور شاہ کشمیری حیات اور علمی کارنامے، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
قاسم صدیقی، اصولِ تدریس، بدون سن
قاضی اطہر مبارک پوری، اسلامی شادی، فرید بکڈپو، دہلی، اشاعتِ جدید، ۲۰۰۵ء

قاضی اطہر مبارک پوری، اسلامی نظامِ زندگی ، ادارہ فیضانِ معرفت، بلساڑ گجرات، اشاعتِ جدید،۲۰۰۳ء
قاضی اطہر مبارک پوری، اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، ندوۃ المصنفین ، دہلی، ۱۹۶۹ء
قاضی اطہر مبارک پوری، افاداتِ حسن بصری، فرید بکڈپو، نئی دہلی، اشاعت جدید ۲۰۰۵ء
قاضی اطہر مبارک پوری، الصالحات، انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی، مبارک پور، ۱۹۸۷ء
قاضی اطہر مبارک پوری، العقد الثمین فی فتوح الہند (عربی)، اشاعتِ ثانی مصر، ۱۹۷۹ء
قاضی اطہر مبارک پوری، ائمہ اربعہ، مکتبہ تنظیم اہلِ سنت، لاہور، ۱۹۴۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، آثار و اخبار، ندوۃ المصنفین ، دہلی، ۱۹۸۸ء
قاضی اطہر مبارک پوری، بناتِ اسلام کی علمی و دینی خدمات، اسلام بک فاؤنڈیشن، دہلی، ۲۰۰۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، تاریخ اسماء الثقات (عربی)، شرف الدین الکتب، ممبئی، ۱۹۸۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
قاضی اطہر مبارک پوری، تدوین سیر و مغازی، شیخ الہند اکیڈمی، ۲۰۰۴ء
قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علماء مبارک پور، دائرہ ملیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، ۱۹۷۴ء
قاضی اطہر مبارک پوری، جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول (عربی)، لشرف الدین الکتب، ممبئی، ۱۹۷۳ء
قاضی اطہر مبارک پوری، حج کے بعد، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء
قاضی اطہر مبارک پوری، خلافتِ بنوامیہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین ، دہلی، ۱۹۷۵ء
قاضی اطہر مبارک پوری، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین ، دہلی، ۱۹۷۳ء
قاضی اطہر مبارک پوری، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین ، دہلی، ۱۹۸۲ء
قاضی اطہر مبارک پوری، خواتینِ اسلام کی علمی و دینی خدمات، دار العلوم دیوبند، ۱۹۹۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء
قاضی اطہر مبارک پوری، دیارِ پورب میں علم اور علماء، البلاغ پبلیشرز، دہلی، ۲۰۰۸ء
قاضی اطہر مبارک پوری، رجال السند والہند (عربی)، ادارہ البلاغ، ۱۹۵۸ء

قاضی اطہر مبارک پوری، طبقات الحجاج، فرید بکڈ پو، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، عرب و ہند عہد رسالت میں، فرید بکڈ پو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء
قاضی اطہر مبارک پوری، علماءِ اسلام کی خونیں داستانیں، قاضی اطہر اکیڈمی، مبارک پور، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
قاضی اطہر مبارک پوری، علماءِ اسلام کے القاب وخطابات، اشاعتِ اول، فرید بکڈ پو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء
قاضی اطہر مبارک پوری، علی وحسین، مکتبہ دائرہ ملیہ مبارک پور، ۱۹۶۰ء
قاضی اطہر مبارک پوری، قاضی اطہر مبارک پوری کے سفرنامے، قاضی اطہر اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۵ء
قاضی اطہر مبارک پوری، قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک، دائرہ ملیہ مبارک پور، ۱۹۸۷ء
قاضی اطہر مبارک پوری، قیصر حبیب ہاشمی، اسلام اور تصویر کائنات میں رنگ
قاضی اطہر مبارک پوری، کاروانِ حیات، فرید بکڈ پو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء
قاضی اطہر مبارک پوری، مآثر ومعارف، یونین پریس، دہلی، ۱۹۷۱ء
قاضی اطہر مبارک پوری، مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم وعلماء، شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند، ۱۹۹۸ء
قاضی اطہر مبارک پوری، مسلمان، انجمن شیخ الہند قاسم آباد، انجام شہید، اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، معارف القرآن، کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، ضلع بھڑوچ، گجرات، ۲۰۰۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، مکتوبات امام احمد بن حنبل، فہیم بکڈ پو، مئوناتھ بھنجن، ۲۰۰۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، مئے طہور، قاضی اطہر اکیڈمی، مبارک پور، ۲۰۰۶ء
قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء
قاضی عبدالغفار، جامعہ کی کہانی، مکتبہ جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء
قاضی عبدالغفار، حیاتِ اجمل، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء
محمد اشرف، ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر، کوہِ نور پریس دہلی، ۱۹۶۳ء
محمود الحسن، عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز اور ارتقاء، نعمانی پرنٹنگ پریس، دہلی، بار اول ۱۹۷۵ء
مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، دفتر دار العلوم دیوبند، سہارن پور، ۱۹۵۵ء

منشی محمد امین زبیری، سیاستِ ملیہ، عزیزہ پریس، آگرہ، ۱۹۴۱ء

رسائل وجرائد

آواز ملک، روزنامہ، بنارس، ۱۹۹۶ء

اخبار انصار، بہرائچ، ۱۹۹۶ء

الاتحاد، بھٹکل، ۱۹۹۶ء

البلاغ (ماہنامہ)، ممبئی، ۱۹۵۶ء

انقلاب (روزنامہ)، ممبئی، ۱۹۷۶ء

انوار العلوم (ماہنامہ)، شیخوپور، ۱۹۹۶ء

برہان (ماہنامہ)، دہلی، ۱۹۶۰ء

ترجمان الاسلام (ماہنامہ)، بنارس، ۱۹۹۶ء

ترجمان دار العلوم (ماہنامہ)، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

حیاتِ نو (ماہنامہ)، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء

دار العلوم دیوبند (ماہنامہ)، ۱۹۹۶ء

ریاض الجنۃ (ماہنامہ)، جونپور، ۱۹۹۶ء

صدرنگ (ماہنامہ)، جعفر لائبریری، مبارک پور، ۱۹۷۰ء

صدق جدید (روزنامہ) لکھنؤ، ۱۹۷۰ء

ضیاء الاسلام (ماہنامہ)، شیخوپور، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء

علم وادب (ماہنامہ)، ۱۹۹۶ء

قومی آواز (روزنامہ) لکھنؤ، ۱۹۹۷ء

معارف (ماہنامہ)، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء

معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۶ء

ندائے شاہی (ماہنامہ)، مرادآباد، ۱۹۹۹ء

نقوش (ماہنامہ)، لاہور، ۱۹۹۶ء

ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء

☆☆☆

تعارف

ڈاکٹر نگار افشاں کا تعلق مردم خیز خطہ اعظم گڑھ سے ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے لڑکیوں کی دینی درسگاہ جامعۃ الصالحات رامپور یوپی کا رخ کیا اور وہاں سے عالمیت اور فضیلت کی ڈگریاں حاصل کیں اس کے بعد بھی ان کا علمی شوق کم نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات (سنّی) میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم۔ ٹی۔ ایچ (ماسٹر آف تھیولوجی) اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر نگار تحریر و تصنیف کی عمدہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ متعدد کانفرنسوں اور سمیناروں میں بھی شرکت کرتی ہیں اور ان کے مقالات علمی و تحقیقی مجلات کی زینت بنتے رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب محترمہ کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں قاضی اطہر مبارک پوری کی حیات و خدمات کے ساتھ ان کی علمی، دینی، سیاسی، تاریخی اور صحافتی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب کی تاریخی کتابوں میں مثلاً رجال السند والھند، خلافتِ راشدہ اور ہندوستان، خلافتِ بنوامیہ اور ہندوستان، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، عرب و ہند عہدِ رسالت میں اور تدوینِ سیر و مغازی پر مدلل نقد و تجزیہ کر کے ان کی قدر و قیمت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امید ہے یہ کتاب قاضی صاحب کے علمی مقام و مرتبہ کو متعین کرنے کے لئے بنیادی ماخذ کا کام دے گی۔ میں اس اہم علمی خدمت پر مصنفہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ

₹ 300/-

Published by:
Averroes Academy, Aligarh
Iqra Colony, Aligarh, U.P. (INDIA)
e-mail: aveacademy2013@gmail.com
Mob. 09761199933